DUE DATE

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re. 1 per day, Over night book Re. 1 per day.

یورپ میں تحقیقی مطالعے

تالیف

آغا افتخار حسین

مجلس ترقی ادب، لاہور

طبع اول : نومبر ۱۹۶۷ء

تعداد : ۱۲۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : مطبع عالیہ ۵/۱۲۰ ٹمپل روڈ ، لاہور

طابع : سید اظہار الحسن رضوی

قیمت : ۲ روپے

نئی نسل کے نام۔۔۔۔

جو اکیسویں صدی کی تہذیب کی معمار ہے

فہرست

مقدمہ ... ... ۹ تا ۵۸

۱ - اردو کی بابت فرانسیسیوں کی چند تحریریں ۱

۲ - یورپ میں اردو ۳۱

۳ - تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی اور

اردو تذکرے ۵۱

۴ - نسخۂ دلکشا ۸۰

۵ - انکتل دوپروں ۱۲۷

۶ - وکٹر ہوگو کی محبوبہ کے خطوط ... ۱۴۶

۷ - رالف رسل ۱۵۳

۸ - نوبل پرائز نہ لینے کے سلسلے میں

ژاں پال سارتر کا تاریخی اعلان .. ۱۵۸

۹ - ژاں پال سارتر کا بیان ۱۷۰

۱۰ - مسلمانوں کا پیرس پر حملہ ۱۷۸

۱۱ - تحقیقی اداروں میں باہمی ربط کی ضرورت ۱۸۷

۱۲ - مغل فن تعمیر ایک فرانسیسی دانش ور کی

نظر میں ۱۹۳

۱۳ - اٹھارویں صدی کے پیرس کی ایک

انجمن آرا خاتون ۱۹۷

۱۴ ۔ سارتر کی ایک ناول ۲۱۱

۱۵ ۔ شعر گفتن چہ ضرور ؟ ۲۲۳

۱۶ ۔ پروفیسر آربری سے ایک ملاقات . .. ۲۲۶

۱۷ ۔ افرو ایشیائی سیمینار... .. .. ۲۳۷

۱۸ ۔ یورپ میں غالب کا مطالعہ ۲۴۰

۱۹ ۔ جنگ اور ادب ۲۶۴

۲۰ ۔ اہل قلم اور اہل تحقیق حضرات کی
خدمت میں چند معروضات ۲۹۱

۲۱ ۔ اہل تحقیق کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق
کی ضرورت ۳۰۷

۲۲ ۔ اشاریہ ۳۲۳

مقدمہ

از

آغا افتخار حسین

مقدمہ

اس کتاب میں وہ مضامین شامل ہیں جو میں نے یورپ (لندن، کیمبرج، روم، [illegible] اور زیادہ تر جرمنی) کے دوران قیام میں لکھے یا ان کا زیادہ تر مواد اس عرصے میں حاصل کیا۔ تحقیق اور مطالعے کے دوران میں بعض اوقات ایسے اہم ماخذ میرے علم میں آئے یا ایسی معلومات حاصل ہوئیں جو دلچسپی کا باعث ہوسکتی تھیں میں نے ان کو بھی مضامین کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ مطالعہ و فکر کے دوران میں بعض ایسے تصورات اور نظریات بھی ذہن میں ابھرے جن کے اظہار کا موقع مجھے وطن واپس آ کر ملا؛ ان کی جھلک بھی ان مضامین میں کہیں کہیں موجود ہے۔ یہ مضامین 'افکار' کراچی، 'اردو نامہ' کراچی، 'نگار' کراچی اور 'صحیفہ' لاہور میں شائع ہو چکے ہیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس موجودہ دور میں مغربی علوم کا مطالعہ اہل مشرق کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانی فکر و تمدن کی تاریخ میں ساڑھے تین ہزار سال سے زیادہ عرصے تک علم و حکمت

کے چراغ مشرق میں روشن رہے اور ان کی روشنی مشرق و مغرب میں دور دور تک پھیلی، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ کوئی پانچ سو سال پہلے قرون وسطیٰ کی تاریکی دور کرنے اور احیائے علوم[1] کے لیے مناسب فضا پیدا کرنے کے لیے اہل یوروپ نے اپنے چراغ مشرقی چراغوں سے ہی روشن کیے تھے۔ لیکن اس تلخ حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آج مغرب میں بہت سے چراغ روشن ہیں اور مشرق کے بیشتر چراغ گل ہو چکے ہیں۔ جو چند چراغ اب تک ٹمٹما رہے ہیں، اگر ان کی لو تیز نہ کی گئی تو یہ بھی ایک ایک کر کے گل ہو جائیں گے۔

یہ حقیقت تلخ ہے لیکن اہل مشرق کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ساڑھے تین ہزار سال سے زائد عرصے تک ساری دنیا کو تہذیب و تمدن سے فیض یاب کرنے کے بعد پندرھویں صدی عیسوی سے ہمارا تمدن روبہ انحطاط ہے۔ لیکن اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے قبل ایک نظر انسانی تمدن میں مشرق اور مغرب کے عروج و زوال کے تقابل پر ڈال لی جائے تو بے موقع نہ ہوگا۔

مشرق و مغرب میں تمدن کے عروج و زوال کا تقابل:

جیسا کہ اہل نظر جانتے ہیں، تمدن کی ابتدائی آماجگاہیں

1- Renaissance

مشرق ہی میں تھیں ۔ وادیٔ نیل ، دوآبۂ دجلہ و فرات اور وادیٔ سندھ کو قدیم ترین تمدن کے گہوارے سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن مشرق کے تمدن کا اثر اور تسلط مغرب پر سب سے پہلے غالباً اس آریائی قوم کے توسط سے ہوا جس کی ایک شاخ کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح یا اس سے قبل وسط ایشیا سے یورپ چلی گئی تھی اور دوسری شاخ جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں آ گئی تھی ۔ یہ اسی قوم کا فیض ہے کہ آج مغرب اور مشرق کی بیشتر زبانوں میں متعدد الفاظ مشترک یا مماثل ملتے ہیں ۔ یہ مشرقی تمدن کی پہلی رو تھی جو مغرب کی طرف گئی اور یورپ کے مغربی علاقوں تک پہنچی ۔ اس عہد کو ہم تاریخ تمدن کا پہلا اہم مرحلہ کہہ سکتے ہیں ۔

اس کے بعد ایشیا اور یورپ کی سرحدوں کے قریبی ممالک میں کبھی کبھی ایک دوسرے پر غلبے کا سلسلہ رہا ۔ یونانی اور رومی تہذیبیں ابھریں لیکن ان کا کوئی خاص اثر مشرق پر نہ ہوا ۔ پانچویں صدی عیسوی میں سلطنت روما کا زوال ہوا ، چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کی بنیاد رکھی گئی اور ساتویں صدی عیسوی میں اسلام ایشیا اور مغرب میں پھیلا ۔ مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ ان کے تہذیبی اثرات اسپین تک پہنچ گئے ۔ یہ مشرقی تمدن کی دوسری رو تھی جس سے یورپ کوئی آٹھ سو سال

تک متاثر رہا - اس لیے ساتویں صدی کو تمدن کا دوسرا اہم مرحلہ کہا جا سکتا ہے -

پندرھویں صدی عیسوی تک مشرقی تمدن کا اثر یورپ پر قائم رہا ، گو چند صدی قبل انحطاط شروع ہو چکا تھا - سنہ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ (اسپین) مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا اور اس طرح واضح طور پر یورپ میں مسلمانوں (اور دوسرے الفاظ میں مشرق) کا تمدن زوال آمادہ ہوگیا - اس طرح مشرقی تمدن کی رجعت قہقری تاریخ تمدن کا تیسرا اہم مرحلہ ہے - یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ اس مرحلے میں مشرقی تمدن کے زوال کے ساتھ ساتھ مغربی تمدن کے عروج کے نہایت واضح آثار ملتے ہیں - مثلاً غرناطہ میں مسلمانوں کی شکست کے چھ سال بعد ہی سنہ ۱۴۹۸ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کیا اور اسی سال واسکو ڈی گاما نے ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھا - اس طرح مشرق اور مغرب دونوں سمتوں میں بیک وقت یورپ کے تمدن کے عروج کا دور شروع ہو گیا -

پندرھویں صدی کے بعد یورپ قرون وسطیٰ کی تاریکی سے نکلا - یونانی تہذیب (جس سے یورپ کو روشناس کرانے میں مسلمانوں کا بہت حصہ ہے) اور مسلمانوں کی تہذیب اور علوم و فنون سے بہرہ یاب ہو کر یورپ کے

اہلِ فکر نے احیائے علوم[1] اور اصلاحِ مذہب[2] کی تحریکوں کو جنم دیا جن کے نتیجے میں صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس رونما ہوئے اور جدید علوم و فنون میں نئے تجربے اور انداز فکر کا ظہور ہوا۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں تیزی سے ترقی ہوئی اور تجارت و سیاست کے توسط سے یورپ کی تہذیب امریکہ اور مشرقی ملکوں میں پھیلتی چلی گئی۔ کئی مشرقی ملک یورپ کے اثر میں آ گئے اور محکوم نوآبادیاں بن گئے: خوش حال سے مفلوک الحال ہو گئے[3]۔

ملک گیری اور نوآبادی کا یہ دور بیسویں صدی کے شروع تک جاری رہا۔ بیسویں صدی میں مشرق کی بیشتر نوآبادیوں پر سے مغربی قوموں کا سیاسی تسلط ختم ہو گیا۔ افریقہ اور ایشیا کے نئی ملکوں کو سیاسی آزادی حاصل ہوئی۔ ان نو آزاد ملکوں میں افریقہ کے بعض ایسے

---

۱ - Renaissance

۲ - Reformation

۳ - محکوم ملکوں کو مفلوک الحال بنانے میں حاکم قوموں کا حصہ اہم ہے لیکن میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کی تمام تر ذمہ داری مغربی ملکوں پر نہیں ڈالتے۔ مشرقی ملکوں کے سیاسی زوال اور فلاکت کے بہت سے اسباب ہیں؛ ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بیشتر ملکوں میں سیاسی استحکام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

ممالک بھی شامل ہیں جو تاریخ کے تقریباً ہر دور میں محکوم رہے یا تہذیب و تمدن کی روشنی سے زیادہ مستفیض نہ ہو پائے۔ ان نو آزاد ملکوں میں ایشیا کے ایسے ملک اور قومیں بھی تھیں جن کا تمدن تاریخ انسانی کا قدیم ترین تمدن ہے۔ بیسویں صدی میں مشرقی ملکوں پر مغربی ملکوں کے سیاسی اقتدار کے ختم ہونے سے ان نو آزاد اور پسماندہ ملکوں کی تاریخ کا نیا اور اہم دور شروع ہوتا ہے جسے تاریخ تمدن کا چوتھا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی اور نو آزاد و پسماندہ اقوام :

بیسویں صدی میں تاریخ تمدن کا یہ چوتھا سنگ میل کئی سمتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس دور میں انسانی تہذیب کے ارتقا کی رفتار نہایت تیز ہو گئی ہے۔ انسانی تمدن کے ابتدائی دوروں میں تہذیبوں کے ارتقا کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ پتھر کے زمانے سے دھات کے زمانے تک پہنچنے کے لیے انسان کو کئی ہزار سال لگے۔ وادیٔ نیل، دوآبۂ دجلہ و فرات اور وادیٔ سندھ کی تہذیبیں کئی سو سال تک تقریباً ایک ہی حالت میں رہیں۔ مشرقی اور مغربی ملکوں میں فکر کی ترقی (یونان، روما، مسلم ممالک اور مغربی یورپ) تقریباً پندرہ سو سال تک نہایت سست رفتاری سے ہوئی۔ احیائے علوم کے بعد ترقی کی رفتار تیز ہوئی اور

سائنس کی ایجادات اور انکشافات نے انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں اور دیگر علوم میں نئے افکار نے جگہ لی اور ان افکار و نظریات پر جلد جلد معتقدات نے فکر انسانی نے ارتقا کے بہت سے مدارج طے کر لیے ۔ لیکن بیسویں صدی میں ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہو گئی ہے کہ اس کی مثال تاریخ تمدن کے کسی دور میں نہیں ملتی ۔ تیس یا چالیس سال کے عرصے میں انسان ہوا میں اڑنے کے خواب دیکھتے دیکھتے واقعی ہوا میں اڑنے لگا ۔ لارڈ رتھرفورڈ نے بیسویں صدی کے شروع میں طبیعات میں تحقیقات کر کے جوہر[1] میں مرکزہ[2] کا نظریہ پیش کیا اور صرف تیس پینتیس سال کے عرصے میں یہ نظریہ ایک طرف جوہری بم کی شکل میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کی صورت میں نمودار ہوا اور دوسری طرف جوہری علاج کی شکل میں انسان کی بقا کا ضامن و معاون بن گیا ۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے چند سال ہی میں انسان نے ایک قسم کا "برقی ذہن" (کمپیوٹر[3]) بھی ایجاد کر لیا ۔ اس صدی میں سائنس اور دیگر علوم و فنون کی ترقی کی صرف نظری اہمیت ہی نہیں، پسماندگی اور واماندگی سے خوش حالی اور تعمیر نو کی طرف بڑھنے کی رفتار میں بھی

Atom - ۱

Nucleus - ۲

Computor - ۳

حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ قدیم تمدنوں کے دور میں کسی ایک تہذیب کی شکست و ریخت کے بعد اس کے دوبارہ ابھرنے میں صدیاں گزر جاتی تھیں ؛ اس کے بعد قرون وسطیٰ میں اس رفتار میں ذرا ترقی ہوئی لیکن پھر بھی سلطنت روما کے زوال کے بعد یورپ کو ابھرنے میں تین سو سال لگے۔ جرمنی تیس سالہ جنگ (۱۶۱۸ع-۱۶۴۸ع) کی زبوں حالی سے تقریباً نصف صدی کے بعد نجات پا سکا۔ لیکن یہی ملک جو ۱۹۴۵ع میں جنگ کے اختتام کے وقت ایک ویرانے کی شکل اختیار کر چکا تھا ، دس سال کے عرصے میں پھر دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار ہونے لگا۔ مشرق میں جاپان نے بھی جنگ کی تباہ حالی کے بعد اسی تیز رفتاری سے ترقی کی ہے۔ اور چین جو بیس پچیس سال پہلے تک تن آسان افیونیوں کا ملک سمجھا جاتا تھا آج اتنی ترقی کر چکا ہے کہ مشرق و مغرب کی بڑی طاقتوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

عہدِ نو کا انداز فکر و عمل :

ترقی کی اس برق آسا رفتار کے دور میں نو آزاد اور پسماندہ ممالک کا انداز فکر و عمل کیا ہونا چاہیے ؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے جن امور کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں :

ـــــــیہ ملک سیاسی طور پر آزاد ہو چکے ہیں لیکن

معاشی زبوں حالی اور پسماندگی کی وجہ سے ابھی عصر ترقی یافتہ ملکوں کے محتاج ہیں۔

عرصہ دراز تک محکوم رہنے اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے ان میں سیاسی شعور کی وہ روایات موجود نہیں جو ترقی یافتہ ممالک میں ہیں۔ اس لیے آزاد ہوتے ہی ان میں سے کئی ممالک معاشی اور سیاسی خلفشار میں مبتلا ہو گئے اور اس انتشار کو دور کرنے اور سیاسی اور انتظامی استحکام قائم کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا جس کے نتیجے میں بعض ملکوں میں کشت و خون ہوا اور بعض ملکوں میں یہ مرحلہ امن و عافیت سے طے ہو گیا۔

سیاسی محکومی کے ختم ہونے کے بعد بھی ان ملکوں کے بعض افراد کے ذہن ابھی تک محکوم ہیں اس لیے وہ ملک کی تہذیبی اقدار کا جائزہ لینے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ ملک کی زبان، تہذیبی روایات اور ہر اس شے کو جو اس ملک و قوم کا تہذیبی سرمایہ ہے، حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا انداز فکر وہی ہے جو محکومی کے دور میں حاکم قوموں کا تھا، یعنی یہ کہ یہ قومیں آزادی کے قابل نہیں، ان کی ثقافت درخور اعتنا نہیں۔

دوسری انتہا پر ایسے افراد ہیں جو سمجھتے ہیں کہ آزادی کے معنی یہ ہیں کہ اس تیز رفتار ترقی کے دور میں ہمیں اپنے انداز فکر و عمل میں کسی قسم کی تبدیلی

کرنے کی ضرورت نہیں ۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس ہزار دو ہزار سال میں انسان نے جو ترقی کی ہے ہم اسے نظر انداز کرکے گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑنے کا مشورہ دیں ۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ آگے کی طرف چلنے کی کوشش کریں لیکن نظریں پیچھے کی طرف ہوں جس کا نتیجہ ظاہر ہے ۔[1]

مذکورۂ بالا دو متضاد انداز فکر کے حامل فریقین میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں فریق تبدیلی نہیں چاہتے ۔ پہلا فریق چاہتا ہے کہ سیاسی طور پر آزاد ہونے کے بعد بھی غلام رہے ۔ دوسرا فریق اس پر مصر ہے کہ چونکہ اس دور کے افکار تازہ میں اہل مغرب کا حصہ زیادہ ہے اس لیے ان افکار سے حذر کرنے کی ضرورت ہے ۔ لہٰذا وسعت نظری نہیں توکم سے کم جمود مناسب ہے ۔

اس پس منظر میں نو آزاد قوموں کو اپنے فکر و عمل کی راہیں متعین کرنا ہیں ۔ جو حضرات آزادی کے

---

۱ ۔ آزادی سے قبل آج سے اکیس سال پہلے فلسفہ جدید پر اپنی ایک کتاب کے دیباچے میں میں نے کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا ۔ دیکھیے ''فکر فرنگ'' نفیس اکیڈمی حیدر آباد دکن سنہ ۱۹۴۶ع ۔ اس عرصے میں صورت حال میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

[illegible]
[illegible]
[illegible] مرض ہے [illegible]
جو قوموں کو خود [illegible]
دوسری قوم اپنی قابل اعتنا نہیں سمجھتی [illegible] قومیں
اپنی تہذیبی حالت پر خود [illegible] کرتی ہیں [illegible]
نہیں کرتیں [illegible]
افراد اس قومی زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ
کسی دوسری زبان میں کوئی کارنامہ نہیں دے سکتے۔
اور [illegible] ہے کہ مہذب اور [illegible] قومیں بھی ان
افراد یا قوموں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں جن کی
کوئی قومی زبان اور قومی تہذیب نہ ہو۔

وہ افراد جو دوسری انتہا کے حامی ہیں یعنی [illegible]
ہمیں مغرب سے متأثر نہیں ہونا چاہیے اور ایسے افراد جو ان
مسائل پر زیادہ توجہ نہیں دیتے، ان کی خدمت میں حسب
ذیل معروضات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں: مشرقی
ملکوں میں مؤخرالذکر انداز خیال کے افراد کی تعداد
بہت زیادہ ہے۔ ان ملکوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہے
جنھیں اس حقیقت کا بہت کم احساس ہے کہ اس بدلتی
ہوئی دنیا میں ہمیں اپنے انداز فکر میں کچھ تبدیلیاں پیدا
کرنے کی ضرورت ہے۔

ارتقا اور تاریخ تمدن :

تاریخ تمدن کے تقریباً ہر دور میں اس کرۂ ارض پر تہذیب کی سطح ہر مقام پر یکساں نہیں رہی - وادیِ نیل، دوآبۂ دجلہ و فرات اور وادیِ سندھ کی قدیم تہذیبوں کے زمانے میں دنیا کے بعض حصے ایسے تھے جن کے باشندوں کی تہذیب اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی - یہی صورت اس دور میں بھی موجود ہے - دنیا کے بعض دشوار گزار علاقے ایسے ہیں جہاں پانچ ہزار سال کی تہذیب کی روشنی ابھی نہیں پہنچی - ان علاقوں کے باشندے تقریباً پتھر کے زمانے اور دھات کے زمانے کے انسانوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں - اور دوسری طرف بعض علاقے ایسے بھی ہیں - جہاں کے لوگوں نے نظام شمسی میں مصنوعی سیارے تخلیق کیے ہیں جو اس کرۂ ارض کے گرد گردش کر رہے ہیں - اسی زمین پر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے گرد و پیش کے حالات سے بھی واقف نہیں اور ایسے بھی ہیں جنھوں نے دریاؤں کے رخ پھیر دیے ہیں اور پہاڑوں کی شکلیں بدل دی ہیں - تہذیب کے ان دو انتہائی مدارج کے درمیان سینکڑوں مدارج ہیں اور دنیا کی ہر قوم ان میں سے ایک سطح پر زندگی گزار رہی ہے - یہ تقریباً وہی صورت ہے جو حیاتیات[1] کی دنیا میں نظر آتی ہے - مثلاً

[1] Biology

حیات کی ابتدائی شکل میں امیبا[1] بھی موجود ہے جو
صرف خوردبین سے دکھائی دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی شکل پر
قائم نہ رہ سکا، اور ارتقا کے دوران کی (یا تازہ
ترین) شکل میں انسان بھی موجود ہے جو سب سے کہیں
زیادہ پیچیدہ اور جاندار حیوانات کی ساخت پر سبقت رکھتا ہے۔
یہاں بھی ارتقا نے ان دو انتہائی مدارج میں لاکھوں
کروڑوں نمونے، پیدا کئے اور چھوڑ دئے جو نمونے موجود ہیں
جو ارتقا کی مختلف سطحوں پر زندہ ہیں۔ ارتقا کے بنیادی
اصولوں سے اہل نظر واقف ہیں۔ حیاتیاتی ارتقا[2] کے بنیادی
اصول کسی حد تک ان اصولوں کے مماثل ہیں جو تمدنی
اور تہذیبی ارتقا میں نظر آتے ہیں، (اس نظریے کی وضاحت
کا موقع نہیں ہے، چند اشارے کافی ہوں گے) جو تمدن
بدلتی ہوئی حالات کے مطابق مطابقت پیدا نہیں کرتے، وہ
ترقی نہیں کرتے یا زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔
جو تہذیبیں مختلف اثرات کے نتیجے میں ضروری خصوصیات
اختیار نہیں کرتیں اور غیر ضروری خصوصیات ترک نہیں
کر سکتیں، ان میں ارتقا کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ جن
قوموں کو کسی معاندانہ مبارزت[3] سے سابقہ نہیں پڑتا یا

---

۱ - Amoeba

۲ - Biological evolution

۳ - Challenge

وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں وہ بالآخر کمزور یا کاہل ہو جاتی ہیں ۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اس دور میں مغربی ممالک کی ترقی صحیح معنوں میں ترقی ہے یا نہیں ۔ بعض حضرات کو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مغرب کی ترقی در اصل ترقی نہیں بلکہ تنزل ہے اور یہ کہ مغربی ممالک مشرقی ممالک کے مقابلے میں نہایت پست ہیں ۔ ان حضرات سے بحث کرنا بےسود ہے ۔ ان کا ذہن ایک مقام پر ٹھہر گیا ہے اور وہ دوسری کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ۔ لیکن بعض حضرات یہ اعتراف کر لیتے ہیں کہ مغربی ممالک نے مادی حیثیت سے ضرور ترقی کی ہے لیکن روحانی حیثیت سے وہ بہت پیچھے ہیں ۔ اب یہ ایک طویل بحث ہے کہ "روحانی" سے کیا مراد ہے ؟ اور یہ کہ اگر مغربی ممالک نے روحانی ترقی نہیں کی تو ہم مشرقی اقوام نے روحانیت میں کیا ترقی کی ہے ؟ لیکن اس بحث میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں ۔ اگر مغربی اقوام روحانیت یا روحانی اقدار میں ہم سے پیچھے ہیں تو سیدھی بات یہ ہے کہ ہمیں ان سے روحانیت کا سبق لینے کی ضرورت نہیں ۔ ہمیں ان سے وہ چیز لینی ہے جو ہمارے پاس ان سے کم ہے یعنی مادی ترقی ۔ ارتقا کی اس سمت میں وہ ہم سے آگے نکل گئے ہیں اس لیے ہمیں ان کی

ارتقائی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ ہم ان کے علوم و مسائل کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں اور جو چیزیں ہمیں مادی ارتقا میں مدد دے سکتی ہیں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان میں سے چند خصوصیات اور اقدار جنہیں ہم مغرب سے لے سکتے ہیں، مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی خصوصیت جس میں مغربی ممالک ہم سے آگے ہیں، سائنس اور ٹکنالوجی ہے۔ اس دور میں رہ کر ہم سائنس اور ٹکنالوجی میں مغرب سے جتنا استفادہ کریں کم ہے۔ ہمیں یہ بات ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ سائنس اور ٹکنالوجی مغرب کی خصوصیت ہے اور چونکہ مغرب ہمارا دشمن ہے اس لیے ہمیں اسے اپنے لیے مضر سمجھنا چاہیے۔ یہ انداز فکر حقیقت پسندانہ نہیں بلکہ ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسے اختیار نہ کرنے سے مغرب کو نہیں، ہمیں ہی نقصان پہنچے گا۔

دوسری خصوصیت آزادیِ فکر، انسان دوستی[1] وغیرہ ہے جو کسی زمانے میں مغرب نے مشرق سے سیکھی تھی لیکن اب مشرق میں اس کی طرف سے روگردانی کی جارہی ہے۔ ہمارا ذہن کھلا ہوا ہونا چاہیے، اس میں تاریک

Humanism - ۱

گوشے نہیں ہونے چاہئیں۔

تیسری خصوصیت، جسے انداز فکر کی حیثیت سے مغرب میں بہت اہمیت حاصل ہے، وہ "عقلیت[1]" اور "تجربیت[2]" ہے۔ "عقلیت" سے یہاں میری مراد یہ نہیں ہے کہ عقل ہر شے کی حقیقت کا احاطہ کر سکتی ہے نا کر چکی ہے۔ عقل کی کارفرمائی کی حدود پر کانٹ نے "تنقید عقل محض" میں نہایت مفصل بحث کی ہے اور اس کے مضمرات سے فلسفے کے طالب علم واقف ہیں۔ یہاں میرا روئے سخن اس انداز فکر کی طرف ہے جس کی رو سے عقل کو ایک گمراہ کن، بے مصرف اور مضر شے سمجھا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں جذبات کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور عام طور پر اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہمیں عقل سے زیادہ عقائد اور جذبات پر اعتماد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی صورت تجربیت کی ہے۔ اگر جذباتیت اور وجدان پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے تو "تجربے" کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ یورپ کی فکری تاریخ میں عقلیت اور تجربیت کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ مسلمانوں کی فکری تاریخ بھی اس سے خالی نہیں۔ ذیل میں ان رجحانات کا نہایت مختصر جائزہ

---

۱ - Rationalism

۲ - Empiricism

پیش کیا جاتا ہے ۔

عقلیت اور تجربیت مغربی مفکرین میں :

سقراط اور افلاطون کے اخلاقی اور تصوراتی نظریات کے بعد ارسطو ہی وہ مفکر ہے جس نے علوم و فنون کو پہلی مرتبہ منظم اور مدون شکل میں پیش کیا ۔ اہل مغرب اسے بانی علوم اور اہل مشرق اسے "معلم اول" کہتے ہیں ۔ اس کے نظریات کی بنیاد تعقل ہے ۔ یونان کے عقلی فلسفے کے اثرات رومی تہذیب میں بھی قائم رہے اور مشرق نے بھی اس سے استفادہ کیا جس کا ذکر آگے آئے گا ۔ قرون وسطیٰ میں جب عیسائیت کو فروغ حاصل ہوا تو مذہب کے عقائد کی صداقت منوانے کے لیے یورپ کے مذہبی پیشواؤں نے اکثر عقلیت کا سہارا لیا ۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں احیائے علوم کی تحریک کی بنیادیں عقلیت ہی پر استوار ہوئیں ۔ یہ عقلی تصورات زیادہ تر ارسطو کے نظریات تھے جو مسلمان مترجمین اور شارحین ابن رشد وغیرہ کے توسط سے مغربی یورپ تک پہنچے ۔ فلسفۂ جدید کی ابتدا ڈیکارٹ (سنہ ۱۵۹۶ - ۱۶۵۰ء) سے ہوتی ہے جس نے فکر کو تشکیک سے شروع کرکے ایک جامع عقلی فلسفہ پیش کیا اور ریاضی کے اصولوں پر مابعدالطبیعیات کی بنیاد استوار کی ۔ اس کے بعد سپنوزا

(۱۶۳۲ - ۱۶۷۷ء) نے بھی دیکارت کی طرح فلسفے کو ریاضی کی تعمیم کی حیثیت سے پیش کیا ۔ چند بنیادی اصول وضع کیے اور ان سے منطقی نتائج اخذ کرتا چلا گیا ۔ اور جوہر ، اعراض ، صفات ، علت ، معلول ، شئون ، جبر و اختیار ، تحفظ ذات ، عرفان وغیرہ تمام مسائل کو تعقل سے حل کرنے کی کوشش کی ۔ اس کے بعد لاک (۱۶۳۲ء - ۱۷۰۴ء) اور بارکلے (۱۶۸۵ء - ۱۷۵۳ء) کے ہاں شدید عقلیت کے خلاف رد عمل ملتا ہے اور تصوراتی فلسفے کی بنیاد پڑتی ہے ۔ ان مفکرین نے خارجی دنیا کے وجود کو انسان کے دام خیال میں اسیر کرنے کی کوشش کی ۔ لاک نے کہا کہ اشیا کی صفات ثانیہ (رنگ ، بو آوازیں ، ذائقہ) کوئی خارجی وجود نہیں رکھتیں بلکہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں ۔ بارکلے اس سے ایک قدم آگے بڑھا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اشیا کی صفات اولی (صلابت ، امتداد ، حرکت وغیرہ) کا وجود بھی ہمارے ادراک پر منحصر ہے ۔ ان کے بعد عمانوئل کانٹ (۱۷۲۴ء - ۱۸۰۴ء) کی عظیم شخصیت ہے جس نے عقل پر "تنقید" کی ۔ جن حضرات نے کانٹ کے فلسفے کا بہ نظر غائر مطالعہ نہیں کیا ہے وہ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ کانٹ نے عقل کا ابطال کیا ہے ، حالانکہ ایسا نہیں ۔ اس کی عہدآفریں کتاب "تنقید عقل محض" تعقل کے حدود معین کرتی ہے ،

اس کا انطباق نہیں کرتی ۔ اس کے نظریے کی بنیاد "تنقید"
ہے یعنی یہ کہ صرف علم کا جائزہ لینے ہی پر اکتفا
نہ کی جائے بلکہ اس پر بھی غور کیا جائے کہ ہماری طور
پر یہ علم کس طرح حاصل ہوا اور یہ علم کن حالتوں میں
حاصل ہونا ممکن ہے ۔ ۔ ۔ وہ سب سے پہلے یہ سوال
کرتا ہے کہ "کیا ترکیبی تصدیقات[1] اولین[2] طور سے
ممکن ہیں[3] ؟ کانٹ کے فلسفے کا بہت بڑا حصہ اسی سوال
کا جواب ہے ۔ یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ کانٹ
نے یہ وضاحت کی ہے کہ عقل کا اندازہ کیا ہے ۔ اس کے
ذریعے علم کن صورتوں میں حاصل کیا جا سکتا ہے ۔
چنانچہ کانٹ کی رائے میں محض تجربہ علم کے لیے کافی نہیں؛
عقل ہی احساسات اور تجربات کے دیے ہوئے جزئیات ۔۔
کلیات قائم کرتی ہے اور انسانی تجربے کے منتشر علم کی
شیرازہ بندی کرتی ہے ۔ لیکن زندگی کے تقاضے اور بھی
ہیں ۔ علم کے بعد عمل کی منزل ہے اور یہاں اخلاقی اقدار کا
مسئلہ سامنے آتا ہے ۔ اخلاق کے قوانین بنانے کے لیے بھی
عقل میں صلاحیت موجود ہے ۔ عقل کی اس قسم کی قانون سازی

---

۱ - Synthetic judgments
۲ - A pirori
۳ - دیکھیے عمانوئل کانٹ : تنقید عقل محض ، باب اول ۔

کی قابلیت کو کانٹ "عقل عملی[۱]" (بہ مقابلہ عقل محض[۲])
کہتا ہے ۔ اور اس طرح "عقل عملی" کے ذریعے حاصل
کیے ہوئے علم کی بنیاد پر کانٹ کا مشہور نظریہ
"حکم اخلاقی[۳]" وجود میں آتا ہے جو اس کی اخلاقیات
کی بنیاد ہے ۔

مندرجۂ بالا سطور سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ کانٹ
نے نہ صرف عقل کا صحیح مقام متعین کیا بلکہ اس کا
ایک مزید پہلو (عقل عملی) بھی پیش کیا ۔ کانٹ کے بعد
ہیگل (۱۷۷۰-۱۸۳۱ء) کا فلسفہ تعقل کا ایسا شاہکار ہے
جس کی مثال فکر انسانی کی تاریخ میں نہیں ملتی ۔ اس نے
فلسفے کی تدوین خالص عقلی اور تصوری بنیادوں پر کی
اور جدلیاتی نظریہ پیش کیا جس کی رو سے متضاد عناصر
کے تصادم کے ذریعے نئے عناصر اور تصورات پیدا ہوتے
ہیں اور یہ عمل کائنات کے ہر شعبے میں جاری و ساری
ہے ۔ اس نظریے کی بنیاد خالص عقلی تھی لیکن عملی
طور پر اس کا اثر عالمگیر ہوا ۔ چنانچہ مارکسزم اسی فلسفے
کی ایک کڑی ہے ۔

ہیگل کی شدید عقلیت کے ردعمل کے طور پر سوپنہاور

Practical Reason - ۱

Pure Reason - ۲

Categorical Imperative - ۳

(۱۷۸۸ء - ۱۸٦۰ء) اور نٹشے (۱۸۴۴ء - ۱۹۰۰ء) کے نظریات انیسویں صدی میں اور برگسوں (۱۸۵۹ء - ۱۹۴۱ء) کا فلسفہ بیسویں صدی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ شوپنہاور نے عقل کے بارے میں کانٹ سے کافی حد تک اتفاق کیا ہے ۔ عقلیت کے رجحان پر اس کے جس نظریے سے زد پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام عالم ایک تصور اور ایک اندھی خواہش حیات کا مظہر ہے جس کا کوئی مقصد نہیں ۔ اس ضمن میں وہ ہندو فلسفے سے بہت متاثر تھا ۔ نٹشے کے ہاں استدلال کی کمی ہے ، جذباتیت زیادہ ہے ، کوئی باقاعدہ نظام فکر مشکل سے ملتا ہے ۔ اس نے عقلیت کے خلاف کوئی جامع اعتراض نہیں کیا بلکہ اپنے ادب نما فلسفے میں کہیں کہیں عقل پر طنز کیا ہے ۔ وہ شوپنہاور سے متاثر تھا ۔ اس نے "خواہش حیات" کی بجائے "خواہش اقتدار" کا تصور پیش کیا جو ارتقا کی ایک شکل ہے اور جس کا مقصود "انسان کامل" کی تخلیق ہے ۔ برگسوں نے زمان و مکان کے مابعد الطبیعیاتی مباحث کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر شے ہر وقت متغیر ہے ۔ سکون فریب نظر ہے ۔ اس نے بھی کانٹ کی طرح عقل کا ابطال نہیں کیا بلکہ اس کی حدود متعین کیں ۔ اس کے خیال میں جہاں عقل کی حدود ختم ہو جاتی ہیں وہاں وجدان ہمارا ساتھ دیتا ہے ۔ برگسوں نے ارتقا کے

مسئلے پر بھی غور کیا اور "تخلیقی ارتقا" کا نظریہ پیش کیا جو ارتقا کے میکانیکی نظریے (ڈارون) پر ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ارتقا کا مقصد صرف ماحول سے مطابقت پیدا کرنا نہیں بلکہ اس عمل سے جدید انواع اور اضافے کی تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ جو قوت ارتقا کے عمل کو جاری رکھتی ہے اسے برگسوں "قوت حیات[1]" کہتا ہے۔ برگسوں نے یہ نظریہ بہت سی دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دلائل عقلی ہی ہو سکتی تھیں "وجدانی" نہیں۔

یورپ کی فکری تاریخ میں عقلیت کے ساتھ ساتھ اور بعض موقعوں پر اس کی مخالفت میں تجربیت[2] کی تحریک مقبول رہی۔ اس نظریے کی رو سے انسان کے علم کا ذریعہ صرف تجربہ ہے، یعنی یہ کہ انسان کا ذہن پیدائش کے وقت ایک لوح سادہ کی طرح ہوتا ہے جس پر آہستہ آہستہ احساسات کے ذریعے نقش و نگار بنتے چلے جاتے ہیں۔ ذہن کی حیثیت بڑی حد تک (بعض تجربی مفکرین کے نزدیک کلی طور پر) انفعالی ہوتی ہے۔ اس نظریے کے لحاظ سے علت و معلول کا نظریہ ختم ہو جاتا ہے۔ آگ لگنے سے کپڑا جل گیا، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ "الف"

۱- Elan Vital

۲- Empiricism

واقعے کے بعد "ب" واقعہ نمودار ہوا۔ یعنی آگ لگی اور کپڑا جل گیا۔ ایک واقعے کا دوسرا واقعے سے علت و معلول کا تعلق نہیں۔ تجربیت کے ابتدائی دور میں یہی یہ نظریہ مقبول رہا لیکن فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء-۱۶۲۶ء) لاک (۱۶۳۲ء-۱۷۰۴ء) ہیوم (۱۷۱۱ء-۱۷۷۶ء) مل (۱۸۰۶ء-۱۸۷۳ء) بنتھم (۱۷۴۸ء-۱۸۳۲ء) نے اس نظریے میں بہت سے اضافے کیے۔ بیکن نے ارسطو کی استخراجی[1] منطق کے بعد استقرائی منطق[2] کی تدوین کی جس کی رو سے علم کی بنیاد واقعات کے مشاہدے اور اس کے بعد منطقی نتائج اخذ کرنے پر ہے۔ یہ طریقہ کار سائنس کی دریافتوں میں ہر جگہ استعمال ہوا۔ اسی طرح باقی تجربی مفکرین نے بھی مشاہدے اور تجربے پر زور دیا۔ تجربیت کی تحریک عقلیت سے اس بنا پر مختلف ہے کہ عقلیت کے انتہا پسندانہ نظریے کے مطابق علم کا حصول محض ریاضی، منطق اور دیگر بدیہی تصورات کے ذریعے بھی ممکن ہے۔ تجربیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ جو نظریہ یا اصول مشاہدے اور تجربے کے ذریعے پرکھا نہ جاسکے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ تجربیت نے بعد میں کئی شکلیں اختیار کیں۔ اثباتیت[3]،

Deductive Logic - ۱

InductiveLogic - ۲

Positivism - ۳

نتائجیت[1] اور دور حاضر کے کئی نظریات تجربیت سے متاثر ہیں لیکن تجربیت نے ہر اہم منزل پر عقلیت کا سہارا لیا ہے کیونکہ ، جیسا کہ کانٹ نے کہا تھا ، تجربات کی بنا پر آخر کار علم کی تدوین تعقل ہی سے ہو سکتی ہے ۔ اس لیے اگر دور حاضر میں سائنس ، فلسفہ ، ریاضی اور منطق کے رجحانات کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ان کی بنیادیں زیادہ تر عقلیت اور تجربیت کے امتزاج پر استوار ہوئی ہیں ۔

مذکورۂ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ وقتاً فوقتاً عقلیت کی شدت کے خلاف ردعمل کے طور پر نظریات پیش کیے جاتے رہے لیکن فکر یورپ میں غالب عنصر عقلیت اور اس کے بعد تجربیت کا ہے ۔

مشرقی ملکوں کی فکری تاریخ متنوع ہے ؛ لیکن یہاں مثال کے طور پر صرف مسلمانوں کی فکری تاریخ کا مختصر جائزہ لیا جائے گا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مسلمانوں کے انداز فکر میں عقلیت کا کیا مقام رہا ہے ۔ مسلمانوں کی فکری تاریخ اس ضمن میں اس لیے بھی اہم ہے کہ فتوحات اور دیگر روابط کی وجہ سے مسلمانوں کی تہذیب کا اثر مغربی ممالک پر نسبتاً زیادہ رہا ہے ۔

---

1 - Pragmatism

عقلیت اور تجربیت مسلمان مفکرین میں :

مسلمانوں کی فکر کی تدوین اور اس کے ارتقا میں غالب اثر ایرانی مفکرین کا ہے ۔ لیکن بقول علامہ اقبال یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ایرانیوں کے ہاں بھی ان کی غیر معمولی ذہانت کے باوجود فکر کا کوئی ایسا جامع نظام نہیں ملتا جیسا کہ کپلا[1] اور کانٹ کے ہاں ملتا ہے ، جس کی وجہ یہ ہے کہ ایرانیوں نے جزئیات کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی جو ایک جامع نظام فکر کی تدوین کے لیے ضروری ہے[2]۔ بہ ہر حال مسلمانوں کے فکر میں بھی عقلیت کو اہم مقام حاصل ہے جیسا کہ حسب ذیل سطور سے ظاہر ہوگا ۔

پیغمبر اسلام ؐ کے زمانے تک اسلام ایک نہایت اجمالی تصور تھا اور سادہ طرز زندگی کا نام تھا ۔ قرآن کریم میں دلائل عقلی موجود ہیں اور عقل کی اہمیت پر بار بار زور

---

۱ - مشہور ہندو فلسفی جس نے مہاتما بدھ سے پہلے سانکھی نظریۂ تخلیق کی بنیاد رکھی تھی ۔ دیکھیے :

S. Radhakrishnan: Indian Philosophy, New York, Macmillan Co. Vol. I p 472.

۲ - دیکھیے :

Mohammed Iqbal: The Development of Metaphysics in Persia, Lahore, Bazm-e-Iqbal p. IX.

دیا گیا ہے ۔ پیغمبر اسلام کے وصال کے بعد بعض امور میں کبھی کبھی اختلاف رائے کیا جاتا تھا لیکن ان کا تعلق زیادہ تر عبادات کے مسائل تک محدود تھا ۔ پیغمبر اسلام کے صحابہ میں حضرت علیؑ نے نظری اور عقلی مسائل پر خاص توجہ دی ۔ لیکن مسلمانوں میں عقلیت کی باقاعدہ تحریک بنو امیہ کی حکومت کے زمانے میں شروع ہوئی ۔ اس تحریک کی محرک بقول شبلی نعمانی وہ "سفاکیاں اور خونریزیاں" تھیں جو بنو امیہ کے ابتدائی دور میں جائز قرار دی جاتی تھیں ۔ اور جب ظالموں سے کوئی پوچھتا تھا کہ تم مسلمان ہو کر ان خونریزیوں کو کیوں جائز رکھتے ہو تو جواب ملتا تھا کہ ہم کچھ نہیں کرتے ، جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے[1] ۔ چناں چہ مذہب کے نام پر ظلم و تعدی کے خلاف معبد جہنی اور حسن بصری نے آواز اٹھائی اور یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ خدا عادل ہے اور اسے عادل ماننا اسی پر منحصر ہے کہ انسان کو اپنے افعال کا مختار مانا جائے ۔ یہاں سے عدلیہ اور قدریہ تحریک شروع ہوئی جس کا نام بعد میں معتزلہ ہو گیا ۔ مسلمانوں میں عقلیت کی یہ سب سے پہلی تحریک تھی ۔ اس تحریک کے بانی یعنی معبد جہنی کو خلیفہ عبدالملک نے سنہ ۶۹۹ ع

(۱) دیکھیے شبلی نعمانی : مقالات شبلی ، جلد پنجم ، مطبع معارف اعظم گڑھ ۔ صفحہ و بحوالہ معارف ابن قتیبہ ۔

(۸۰ ھ) میں قتل کروا دیا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تحریک اتنی مقبول ہوئی کہ خلفاء بنو عباس نے بطور مسلک قبول کر لیا۔ خلفائے عباسیہ میں منصور، عمرو بن عبید معتزلی کا دوست تھا، اس نے اعتزال کی حوصلہ افزائی کی اور پہلوی، سریانی اور یونانی زبانوں سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ مشہور معتزلی عالم واصل بن عطا نے اعتزال کی ترویج کے لیے اپنے شاگردوں کو دوسرے اسلامی ملکوں میں بھیجا۔ چنانچہ آرمینیا میں بہت سے لوگوں نے اعتزال کو قبول کر لیا اور منصور کے بعد خلیفہ ہارون رشید کے ابتدائی دور میں نشر اعتزال کو ترقی ہوئی۔ اس کے بعد خلیفہ مامون نے خود اعتزال کو قبول کیا اور ابوالہذیل علاف اور نظام جیسے معتزلی حکما کا شاگرد ہو گیا۔ مامون کے بعد معتصم اور اس کے بعد واثق دونوں خلفا معتزلی ہوئے۔ اس کے دور میں مشہور معتزلی قاضی احمد ابن ابی داؤد کو بہت اقتدار حاصل ہوا۔ معتزلہ کی آخری اہم شخصیت ابو علی جبائی ہے جس نے سنہ ۹۱۵ع (۳۰۳ھ) میں وفات پائی۔ اعتزال کی مخالفت میں اشعری تحریک کی ابتدا چوتھی صدی میں ہو چکی تھی لیکن چوتھی صدی ہجری کے آخر تک عرب، عراق، مصر، خراسان، فارس، کرمان، خزرستان اعتزال یعنی مسلمانوں کی عقلی تحریک کے زیر اثر آ چکے تھے۔

اعتزال کی عقلی تحریک کے زوال کے بعد یا ردعمل کے طور پر تین فکری تحریکیں وجود میں آئیں :

اول اشعری تحریک جس کا بانی ابوالحسن اشعری تھا ۔ یہ پہلے معتزلی تھا لیکن بعد میں اس مسلک سے ہٹ گیا ۔ یہ قرآن و حدیث کے حوالوں سے نظری مسائل کا جائزہ لینے کا قائل تھا ۔ اس نے جبر و قدر کے مسئلے میں مبہم راستہ اختیار کیا ۔

دوسرے تصوف جس میں وجدان کے تصور کو فروغ ہوا ۔

اور تیسرے 'اخوان الصفا' جس کے ارکان معتزلہ اور شیعی مسلک سے بہت قریب تھے[1] اور جنھوں نے ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کی جو دنیا میں اپنی قسم کی پہلی انسائیکلوپیڈیا ہے ۔ اس میں چودہ مقالے ریاضی اور منطق پر ، گیارہ تصوف ، نجوم وغیرہ پر ، سترہ سائنس پر جن میں علم ہیئت ، جغرافیہ ، نباتیات ، حیوانیات ، طبیعیات ، کیمیا موسیقی وغیرہ پر شامل ہیں ۔ پچاس ارکان کی اس جماعت نے اس کتاب میں سائنس ، فلسفہ اور مذہب کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے ۔

---

۱ ۔ دیکھیے :
M. Saeed Shaikh : Studies in Muslim Philosophy, Lahore, Pakistan Philosophical Congress, 1962, p. 43.

مذکورۂ بالا تحریکوں میں صرف تصوف کی تحریک براہ راست عقلیت کے خلاف تھی۔ اس تحریک میں وجدان اور جذبات پر زور دیا گیا اور یہ انداز فکر مذہب اور خصوصاً شاعری میں بہت مقبول ہوا۔ بقیہ دونوں تحریکیں عقلیت کی براہ راست مخالف نہیں تھیں۔ اشاعرہ نے معتزلہ کے نظریات کی مخالفت کی اور اس کے لیے منطقی براہین بھی استعمال کیے، لیکن تعقل تو رد نہیں کیا۔ اخوان الصفا کی تحریک تو ایک لحاظ سے عقلیت اور اعتزال کی ترقی یافتہ صورت تھی۔

فکری تحریکوں کا ذکر کرنے کے بعد اب ہم مختصراً اہم مسلمان فلسفیوں کا ذکر کریں گے۔

الکندی (۸۰۳ع ۸۷۳ع) فیثا غورث، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے افکار سے متاثر تھا۔ اس نے اپنے فکر کی بنیادیں (دیکارت کی طرح) ریاضی پر استوار کیں اور اس طرح سائنس کو فلسفے کے قریب لانے کی کوشش کی۔

ابوبکر محمد ابن رازی (۸۶۴ - ۹۲۴ع) طبیب، ماہر طبیعیات، ماہر کیمیا، ماہر نفسیات اور فلسفی تھا۔ اس نے مذہب کے بعض عقائد کی مخالفت کی جو اس کے نزدیک عقل کے خلاف تھے، اس لیے وہ بعض مورخین اور حکما کے ہاں بہت معیوب ہے اور غالباً اسی لیے اس کی بہت سی تصانیف نایاب ہیں۔ فارابی (سنہ ۸۷۰ - ۹۵۰ع)

ارسطو کی منطق کا بہت معترف تھا۔ اسے "معلم ثانی" بھی کہتے ہیں۔ فارابی نے علم الوجود، مابعد الطبعیاتی مذہب، علم کائنات، عقلی نفسیات، فلسفہ، سیاسیات سب ہی موضوعات پر لکھا ہے۔ فارابی کا سب سے زیادہ اہم کارنامہ منطق کی تعمیر اور اس کی بنیادوں کا تعین ہے۔ وہ خدا کے وجود کے ثبوت کے لیے بھی منطقی دلائل پیش کرتا ہے۔

شیخ الرئیس الحسین ابن عبداللہ ابن سینا (۹۸۰-۱۰۳۷ء)
کو اہل یورپ مسلمان مفکرین ہی میں نہیں بلکہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر عہد کے عظیم ترین حکما میں شمار کرتے ہیں[1]۔ فلسفے میں ابن سینا کے افادات زیادہ تر منطق، نفسیات اور مابعد الطبیعیات میں ہیں۔ منطق میں ابن سینا نے فارابی کی شرحوں سے استفادہ کیا جو اس نے ارسطو کے "Organon" پر لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ منطق پر ابن سینا کے نظریات اس کے مقالات و کتب موسومہ "النجاۃ" "الاشارات" اور

---

۱ - دیکھیے:

George Sarton: Introduction to the History of Science Baltimore, 1927, Vol. I p, 709 ; V , Courtois. „Avicena the Prince of the Larned," Indo Iranica, 1952-53' Vol VI, No. 3 pp. 46-53, quoted by M. Saeed Shaikh, Ibid, p. 87

"دانش نامۂ علائی" میں ملتے ہیں۔ منطق کی صوری[1] حیثیت پر بحث کرنے سے پہلے ابن سینا منطق کی حدود متعین کرتا ہے اور اسے ان دلائل کی بنیاد قرار دیتا ہے، جو تمام اشیا کی ہیں۔ علم الاشیاء کے لیے سب سے پہلے منطق کی ضرورت ہے جس کے لیے فہم کے چند مبادی اور بدیہی تصورات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ریاضی کے بدیہیات[2] (یہاں ابن سینا کانٹ کے موقف کے بہت قریب آ گیا ہے اور اس کے پیش رو ہونے کی حیثیت سے ابن سینا کے افکار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے) تعقل کے مضمرات پر بحث کرنے کے بعد ابن سینا نے (کانٹ کی طرح) عقل کی حدود متعین کی ہیں۔ اور پھر "تجربہ" کا تجزیہ کیا ہے اور یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ علم کے لیے تعقل اور تجربہ لازم و ملزوم ہیں۔ تعقل کے بغیر تجربہ بے معنی ہو جائے گا اور تجربے کے بغیر تعقل کافی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ابن سینا نے بیان کیا ہے کہ کس طرح تعقل اور تجربہ مل کر ان تصدیقات[3] کی تدوین کرتے ہیں جو ہر سائنس کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جن سے سائنس ہر منزل پر استفادہ کرتی ہے۔ اس طرح ابن سینا نے معقولات کے وہ نظریے پیش کیے جو

۱- Formal Logic

۲- Axioms

۳- Judgements

تقریباً پانچ سو سال بعد یورپ میں "عقلیت" اور "تجربیت" کی فکری تحریکوں میں ملتے ہیں۔ ابن سینا کے افکار میں دیکارت کی تشکیک، کانٹ کا عقل محض اور عمل عملی کا نظریہ، حتیٰ کہ برگسوں کے تخلیقی ارتقا کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن سینا کے احترام میں یورپ نے کبھی بخل نہیں کیا۔ ہر تاریخ میں ابن سینا کو فکر انسانی کا عظیم محسن تسلیم کیا گیا ہے۔ پیرس یونیورسٹی کی کئی عمارتوں میں ابن سینا کی تصاویر آویزاں ہیں۔ ابن سینا کے افکار پر اب بھی تحقیق جاری ہے[1] اور اب اسے تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ ابن سینا مسلمانوں کے فکر کے نقطۂ عروج کا مظہر تھا۔

ابن سینا کے بعد الغزالی (سنہ ۱۰۵۸ - ۱۱۱۱ع) نے بھی ابن سینا (اور دیکارت) کی طرح تشکیک سے ابتدا کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ محسوسات ہمیں دھوکا دیتے

---

۱ - اس مضمون میں "عقلیت" پر ابن سینا کے افکار کی ایک جھلک پیش کی گئی ورنہ جیسا کہ اہل نظر جانتے ہیں، ابن سینا ایک پہلودار عظیم شخصیت تھی۔ فلسفے کے دیگر موضوعات کے علاوہ طب، طبیعیات، ہیئت، موسیقی وغیرہ پر ابن سینا کے افادات اتنے بسیط ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ایک مضمون میں کیا ایک ضخیم جلد میں بھی ممکن نہیں۔

ہیں اور عقل بھی ہماری رہنمائی نہیں کرتی ۔ چناں چہ غزالی نے فلسفیوں کے [illegible] جو میں مذہبی [illegible] و معلول کے تصورات بھی [illegible] اور بعض مذہبی عقائد [illegible] غزالی کو عقل کا شدید مخالف سمجھا جاتا ہے لیکن اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو ایسا نہیں [illegible] کی طرح غزالی نے بھی عقل کی حدود متعین کیں ۔ اس کے مضمون میں [illegible] ۔ مذہب کی مدافعت کی لیکن سائنس اور فلسفے کا ابطال نہیں کیا ۔ اس کی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" اس دور کے فلسفیوں کی مذہب کی مخالفت کے خلاف ایک رد عمل ہے ۔ لیکن اس کتاب میں بھی اس نے عقل کو باطل قرار نہیں دیا بلکہ اسے تصدیقات کی آخری کسوٹی خیال کرتا ہے ۔ چناں چہ "تہافۃ الفلاسفہ" میں اس کا حسب ذیل قول نہایت معنی خیز ہے اور اس کے موقف کی نہایت جامع نمائندگی کرتا ہے ۔ غزالی لکھتا ہے :

> "کسی مذہبی حقیقت سے اس وقت تک انکار نہ کرو جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ منطقی نقطۂ نظر سے ناممکن ہے ۔ اور کسی فلسفیانہ حقیقت کو اس وقت تک قبول نہ کرو جب تک یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ

اس سے انکار منطقی طور پر نا ممکن ہے[1]۔"

اس کے علاوہ عمر کے آخری حصے کی تصنیف "مشکواۃ الانوار" میں غزالی نے تسلیم کیا ہے کہ عقل ایسی منزل پر پہنچ سکتی ہے جہاں وہ اپنے سے ماورا ہوجائے اور حقیقت مطلق[2] کا ادراک کر لے۔ اس سے غزالی کے بارے میں یہ خیال صحیح نہیں کہ اس نے عقل کو رد کر کے محض جذبات اور وجدان کی تعلیم دی، جیسا کہ ایک پاکستانی مصنف نے لکھا ہے۔ یہ امر افسوس ناک اور تعجب خیز ہے کہ علامہ اقبال نے بھی اپنی کتاب "اسلام میں مذہبی افکار کی تشکیل جدید" میں غزالی کے اس موقف کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے[3]۔

غزالی کے بعد مسلمانوں میں سربرآوردہ مفکرین مشرق کی بجائے مغرب میں پیدا ہوئے۔ ان میں سے پہلے تین مفکرین اسپین میں اور ایک تیونس میں پیدا ہوا۔ ابن باجہ (۱۱۰۶ - ۱۱۳۸ء) ہسپانوی فلسفی شدید عقلیت کا حامی تھا۔ وہ عقل محض کو نہ صرف حقیقت مطلق کے ادراک کا ذریعہ سمجھتا تھا بلکہ انسانی

---

۱ - یہ اقتباس میں نے محمد سعید شیخ صاحب کی کتاب (صفحہ ۱۳۹) سے لیا ہے، کتاب کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔

۲ - Absolute

۳ - دیکھیے : M. Saeed Shaikh, Ibid. p. 141

زندگی کی معراج بھی سمجھتا تھا کہ انسان عقل عامہ کے ساتھ مل جائے - ابن طفیل (۱۱۱۰ - ۱۱۸۵ع) نے اپنے فلسفیانہ افکار کو ایک تمثیلی[۱] قصے میں پیش کیا ہے - اس ناول کا نام "حیّ ابن یقظان" ہے - ابن طفیل نے علم کے منطقی اور وجدانی ماخذ میں امتیاز کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تعقل کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ فطرت کے مطالعے سے انسان ذات صفات الٰہی بھی معلوم کر سکتے ہیں -

ابن رشد (۱۱۲۶ - ۱۱۹۸ع) کو ارسطو کے شارح اور فلسفی کی حیثیت سے یورپ میں بہت شہرت حاصل ہوئی - اس نے بعض مذہبی عقائد کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کیا جو عام خیالات سے مختلف تھے - لیکن اس نے مذہبی عقائد کی عقلی بنیادوں پر تعمیر کرنے کی کوشش کی - اس کا اصرار تھا کہ فلسفے اور مذہب میں اختلاف نہیں ہونا چاہیے - کلام الٰہی کی زبان اور انداز بیان پر غور کرنا چاہیے - اگر کلام الٰہی کے متن میں کوئی ایسا حصہ نظر آئے جو بظاہر عقل یا فلسفے کے منافی نظر آتا ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے معنی وہ نہیں جو بظاہر معلوم ہوتے ہیں بلکہ اس کے معنی زیادہ عمیق ہیں -

---

Allegory - ۱

ظاہری معنی ہر شخص کے لیے ہیں لیکن عمیق معنی کا ابلاغ صرف اہل علم ہی کر سکتے ہیں ۔ اس لیے مذہبی مسائل کو ہر طبقے کے لوگوں کو ان کی فہم کی سطح کے لحاظ سے سمجھانے کی ضرورت ہے[1] ۔ ابن رشد کا سارا انداز فکر بنیادی حیثیت سے عقلی ہے ۔ اس نے غزالی کی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" کے جواب میں "تہافۃ التہافۃ" لکھی جس میں غزالی کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو اس نے عقل محض پر کیے تھے ۔ "مقالہ فی العقل" میں ابن رشد نے بحث کی ہے کہ عقل ہیولائی اخیر درجے تک پہنچ کر روحانیت محض کا ادراک کس حد تک کر سکتی ہے ۔ اس کے علاوہ دیگر رسائل میں ابن رشد نے ارسطو اور فارابی کی منطق کا مقابلہ کیا ہے اور عقلیت کے مبادیات کی تعمیم کی ہے ۔ ابن رشد کا اثر نہ صرف اسپین میں بلکہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی ہوا جہاں اس کے تلامذہ نے اسپین سے نکل کر اس کے نظریات کی اشاعت کی ۔ تیرھویں صدی کے ختم ہونے سے کچھ پہلے ابن رشد کی بیشتر تصانیف لاطینی زبان میں ترجمہ ہوچکی تھیں ۔ ابن رشد کا فلسفہ فرانس ، جرمنی ، سوئٹزر لینڈ ، اٹلی وغیرہ میں جلد

---

۱ ۔ مقالہ کیجیے حضرت علیؓ کا مشہور مقولہ "کلم الناس علی قدر عقولہم ۔"

مقبول ہو گیا ۔ اٹلی کا مشہور قدیم مدرسہ پادوا[1] ایک زمانہ تک ابن رشد کے فلسفے کی تعلیم کا مرکز رہا اور عرصے تک سوربون (پیرس) میں ابن رشد کے فلسفے پر مباحثے ہوتے رہے ۔ ابن رشد کا فلسفہ ابھی تک یورپ کی فکری تاریخ کا ایک اہم باب سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ اپنے وطن میں ابن رشد کی قدر نہیں ہوئی ۔ بعض مذہبی علما نے اس کی مخالفت کی اور خلیفہ وقت منصور نے مجبور ہو کر ابن رشد کو جلا وطن کیے جانے کا حکم دیا[2]۔ ابن رشد کے ساتھ اور بڑے بڑے فضلا بھی جلا وطن کر دیے گئے ۔ ابن رشد بہت عرصہ عالم غربت میں رہا ۔ آخر کار منصور کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔ اس نے ابن رشد کو مراکش میں طلب کیا لیکن ابن رشد کا مراکش پہنچ کر انتقال ہو گیا اور اس واقعے کے ایک ماہ بعد خلیفہ منصور نے بھی انتقال کیا ۔

ابن خلدون (۱۳۳۲-۱۴۰۶ء) تیونس کا رہنے والا تھا اور اپنے فلسفۂ تاریخ کی وجہ سے عالم گیر شہرت کا مالک ہے ۔ ابن رشد کی شدید عقلیت کے ردعمل کے طور پر ابن خلدون نے بھی منطق کو ناقص اور فلسفے کو مذہب

---

۱ - Padua

۲ - شبلی نعمانی : کتاب مذکورہ ۔ صفحہ ۱۰۲ ۔

کے لیے خطرہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے مشہور "مقدمہ" میں فلسفۂ تاریخ کی تعمیم میں منطقی استدلال مسلمہ اور تجربیت کے اصولوں ہی سے استفادہ کیا ہے۔ چناں چہ اس نے تاریخ میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول معین دینے وقت لکھا ہے کہ ان واقعات کو کسی ماورائی قوت کے دخل یا مصلحت ایزدی پر محمول کرنے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ تجربے اور تعقل کی روشنی میں ان کی تحلیل اور توجیہ کی جائے۔ ابن خلدون نے قوموں کے عروج و زوال کا ارتقائی نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ قوم کو ایک جسم حیوانی[1] خیال کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قوم کی زندگیوں میں بھی ایک حد تک نمو و نما کے بعد انحطاط یا ضعفی کا دور آنا لازمی ہے جب وہ رو بہ زوال ہو جاتی ہیں[2]۔ چناں چہ قوموں کے عروج و زوال کے لیے کم و بیش وہی اصول نافذ ہیں جو علم حیوانات میں موجود ہیں (اور جن کی بنیاد حسیت اور تجربیت ہو سکتی ہے وجدانیت نہیں) ابن خلدون نے تجربیت کی مانند میں استقراء اور استخراج کے اصولوں کا ذکر کیا ہے جو تعقل اور تجربیت سے حاصل ہوتے ہیں۔

---

۱ - Organism

۲ - اس نظریے کی تائید بیسویں صدی میں Spengler نے اور تردید Toynbee نے کی ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی فلسفے کی طرح مسلمانوں کا فلسفہ بھی زیادہ تر عقلیت پر مبنی ہے۔ کبھی کبھی شدید عقلیت کے خلاف (مذہب کی مدافعت میں) رد عمل کے طور پر بعض تحریکات اٹھتی رہیں لیکن عمومی طور پر مسلمانوں کے افکار پر ان کے عروج کے زمانے میں عقلیت اور حریت ہی کا رجحان غالب رہا۔

انداز فکر کی تشکیل جدید کی ضرورت :

مشرق نے مغربی تمدن کو ساڑھے تین سو سال سے زیادہ عرصے تک مسلسل سامنے پا کر بہت سے حصوں سے مشرق کا فکر و تمدن بڑی حد تک مختلف ہے۔ تمدن کی عملی سطح پر فنون صنعت میں پوری آزادی سے بیش بہا عمل ہے اور پورے فکر کا آخری نمائندہ بھی ہندوستان ہے۔ اس کے بعد کوئی "مشرق" ایسا نہیں جس کے افکار نے دنیا کے فکر پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو۔ سیاسی حیثیت سے مشرق کے بیشتر ممالک اس ڈیڑھ سو سال میں محکوم رہے اور بیسویں صدی میں آزاد ہوئے ہیں۔ اور جو محکوم نہیں ہوئے ان پر بھی مغربی ملکوں کی سیاست کا اثر غالب رہا۔ مشرقی ممالک سخت معاشی پستی میں مبتلا ہیں، حتیٰ کہ بعض ملکوں میں ہر سال سیکڑوں لوگ بھوک سے مرجاتے ہیں۔ آزاد ہونے کے بعد بھی بیشتر مشرقی ممالک معاشی

مسائل کی وجہ سے مغربی ممالک کی سیاست میں الجھے ہوئے ہیں ۔ اس مقدمے کی تحریر کے دوران مشرق وسطیٰ میں ایک جنگ ہوئی اور بعض مشرق ممالک کو ان کی افواج کی شجاعت کے باوجود چند روز میں شکست ہو گئی ۔ اس جنگ سے ظاہر ہو گیا کہ دنیا کی بڑی طاقتیں جب چاہیں کسی چھوٹے ملک کو دوسرے ملک کے مقابلے میں طاقتور یا کمزور کر سکتی ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ کچھ عرصے میں وہ اس قدر با اختیار ہو جائیں کہ جس پسماندہ ملک کو چاہیں زندہ رکھیں اور جس ملک کو چاہیں نیم مردہ کر کے سسکنے کے لیے چھوڑ دیں ۔ یہ حقیقت بہت بھیانک معلوم ہوتی ہے لیکن دنیا اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ یہ نا ممکن نہیں ۔

جیسا کہ مقدمے کے شروع میں عرض کیا گیا ، ہم ارتقا کے ایک اہم دور سے گزر رہے ہیں ۔ انسانی ارتقا کی ایک اہم منزل وہ تھی جب اس نے انسان کی شکل اختیار کی لیکن اب تقریباً پانچ لاکھ سال تک انسان رہنے کے بعد انسان اور انسان میں تہذیبی اور تمدنی سطح پر اس قدر بنیادی فرق پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جلد ایک قوم کا انسان دوسری قوم کے انسان کے مقابلے میں اتنا ہی طاقتور ہو جائے گا جتنا کہ آج ایک عام انسان دوسرے حیوانات کے مقابلے میں طاقتور ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ بڑی طاقتیں آپس میں ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتی ہیں لیکن اس سے نسبتاً کمزور قوموں کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اول تو طاقتور قومیں اپنی لڑائیاں لڑنا جانتی ہیں، کمزور ملکوں کی لڑائیاں لڑنی نہیں چاہتیں اور دوسرے یہ کہ طاقتور قومیں بعض اوقات وقتوں میں کمزور قوموں کے مقابلے میں متحد ہو جاتی ہیں۔

ایسی صورت حال میں ہم ترقی یافتہ ملکوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ اور ان کا انداز فکر کیا ہونا چاہیے؟ ایک انداز فکر تو یہ ہے کہ ضعیف قوموں کو کوسا کیا جائے۔ ان کے تمدن کو مطعون کیا جائے۔ اس سلسلے میں عریانیت، بحرانیت، سائنس، ٹکنالوجی اور وہ سب کچھ جس کی بنا پر یہ قومیں ترقی کر رہی ہیں، قابل مذمت اور قابل حذر قرار دی جائیں۔ عمل کی بجائے جذباتیت کی تعلیم دی جائے۔ حال اور مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف نظر کر کے مشرق کی برتری کے گیت گائے جائیں۔ نہایت پسماندہ ہونے کے باوجود بھی دعویٰ کیا جائے کہ ہم سب قوموں سے اعلیٰ اور برتر ہیں بلکہ مغربی قوموں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ علم و حکمت کا سبق ہم سے لیں۔

ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن یہ انداز فکر میرے فہم سے بالاتر ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تمام پسماندہ قومیں متحد

ہو جائیں تو طاقت ور قوموں پر غلبہ پا سکتی ہیں ۔ یہ مبارک خیال ہے ، البتہ دشواری صرف یہی ہے کہ پسماندہ قوموں کے باہمی اختلافات اور طاقتور قوموں کے فہم و فراست اور ڈپلومیسی سے یہ توقع رکھنا کہ سب کمزور قومیں جلد متحد ہو جائیں گی یا ایسا ہونے دیا جائے گا خوش فہمی ہوگی ۔ کاش یہ اندازہ غلط ثابت ہو لیکن گزشتہ نصف صدی میں تو اس قسم کے اتحاد کے آثار پیدا نہیں ہوئے ۔

غالباً آخری صورت یہی باقی رہ جاتی ہے کہ اگر طاقتور قوموں کی حالت کو بدلنا پسماندہ قوموں کے بس کی بات نہیں تو پسماندہ قومیں اپنے انداز فکر و عمل میں مناسب تبدیلیاں کریں اور اس کے لیے ہم یہ غور کریں کہ ہم طاقتور قوموں کے فکر و عمل کے کون سے عناصر اپنا سکتے ہیں ۔ اس مقدمے میں مندرجہ بالا سطور میں یہی نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ سائنس ، ٹکنالوجی ، آزادی فکر ، عقلیت اور تجربیت وہ عناصر ہیں جنھیں ہمیں اپنانا ہوگا ۔ یہ خصوصیات اس دور میں زیادہ تر مغربی ممالک ہی کا حصہ ہیں لیکن ہماری تاریخ فکر ہمیں بتاتی ہے کہ یہ خصوصیات ہمارے لیے اجنبی نہیں ۔ ان خصوصیات کے احیا کی ضرورت ہے لیکن یہ احیا صرف تہذیب رفتہ کی قصیدہ خوانی سے حاصل نہیں ہوگا ۔ اس کے لیے ہمیں

ترقی یافتہ قوموں کے انداز فکر کے تنقیدی مطالعے کی ضرورت ہے کیوں کہ گزشتہ پانچ سو سال میں تاریخی خلا کو مغربی قوموں ہی نے پر کیا ہے ۔ اس سلسلے میں تاریخی تسلسل کی ضرورت ہے ۔ مثلاً ارسطو کی منطق اور اخلاقیات جیسے عظیم افکار نوعی اور دنیا کا ہر مفکر آج بھی اس کا خوشہ چیں ہے ۔ لیکن آج ارسطو کے افکار سے براہ راست کوئی استفادہ نہیں کرتا ۔ ارسطو سے استفادہ تیئیس سو سال کی فکری تاریخ کے پس منظر میں ہی کیا جاتا ہے ۔ ایسے ہی ابن سینا ، فارابی اور غزالی کے افکار آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں لیکن ان افکار کا مطالعہ کرتے وقت فکر کے اس ارتقا کو نظر انداز کرنا غلطی ہوگا جو اس آٹھ نو سو سال کے عرصے میں ظہور پذیر ہوا ہے ۔

اگر ترقی یافتہ قوموں کو دشمن بھی تصور کر لیا جائے تو بھی ہم ان کا مقابلہ اسی وقت کر سکتے ہیں جب ان کے انداز فکر و عمل سے اچھی طرح واقف ہو جائیں ۔ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں اہل مغرب نے مسلمانوں کے افکار اور ان کے طریقہ حرب کا مطالعہ کیا تھا ۔ مشرق وسطیٰ کی حالیہ جنگ (۱۹۶۷ع) سے پہلے اہل اسرائیل مصریوں اور روسیوں کے طریقہ حرب کا عرصے

تک مطالعہ کر چکے تھے[1] ۔

ان امور کے پیش نظر ہمیں اپنے انداز فکر کی تشکیل جدید کرنا ہوگی ۔ جدید افکار اور مغرب کے ہر فکر و عمل کے بارے میں ایک منفی رجحان ہمارے لیے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے ۔ ہمیں ان رجحانات کو نظر انداز کرنا ہوگا جو ہماری توجہ محض ماضی کی طرف ... مبذول کرتے ہیں یا جو عقل کے مقابلے میں جذبات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ ہمیں اس ضمن میں مثبت انداز فکر اختیار کرنا ہوگا ۔ ممکن ہے بیسویں صدی کی ابتدا میں کسی رد عمل کے طور پر جذباتیت کے رجحانات اور عقلیت کی مخالفت برمحل ہوں لیکن اس دور میں مشرق کی جذباتی اقوام کے لیے مزید جذباتیت کی تعلیم مضر ہو سکتی ہے ۔ اس کے مقابلے میں عقلیت اور تجربیت کا مسلک زیادہ مفید ہوگا ۔

یہ صحیح ہے کہ اہل مغرب نے ترقی کر کے اپنی زندگی کو پیچیدہ بنا لیا ہے لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں ۔ ارتقا کا اصول یہی ہے کہ ارتقا یافتہ اجسام حیوانی

---

۱ ۔ اس حقیقت کا انکشاف ایک انگریز نامہ نگار نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے جو اس نے تل ابیب میں قیام کے دوران لکھی تھی ۔ دیکھیے :

Charles Douglas-Home: "Years of Preparation led to Israil Victory", The Times, London, June 14, 1967.

کم ارتقا یافتہ اجسام کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ جسمانی اور ذہنی نظام کے مالک ہوتے ہیں ۔ اَمیبا[1] جسمانی لحاظ سے نہایت سادہ نظام کا مالک ہے ۔ حتیٰ کہ وہ اپنے جسم کو ایک شکل پر قائم رکھنے پر بھی قادر نہیں ۔ اس کے مقابلے میں اور زیادہ ارتقا یافتہ حیوانات اور انسان کہیں زیادہ پیچیدہ جسمانی اور ذہنی نظام کے مالک ہیں ۔ یہ بہرحال ماننا چاہیے ہم پسند کریں یا نہ کریں ۔ کہ یہ سب نوعیں کم ارتقا یافتہ قوموں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور خوش حال ہیں ۔ وہ ہر لمحہ ہمارے ماحول پر اثر انداز ہیں اور اسے تبدیل کر رہی ہیں ۔ اگر ہم نے اس ماحول سے مطابقت پیدا نہ کی تو ہم یہاں اس میں نہیں رہ پائیں گے ۔ ارتقا کسی کا انتظار نہیں کرتا ۔ جو انواع اور اصناف ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کرتیں اور ارتقا کا ساتھ نہیں دیتیں ، وہ یا تو ارتقا کی فروتر منزل میں رہ کر ہمیشہ کے لیے اعلیٰ ارتقا یافتہ انواع کی محکوم ہو جاتی ہیں ، یا دنیا سے نابود ہو جاتی ہیں ۔ اور یا پھر ختم ہو کر فوسل (Fossil) بن جاتی ہیں ۔

لیکن اس ضمن میں ہمیں ارتقا کے عمل کا ایک نہایت اہم اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے ؛ وہ اصول یہ ہے

1۔ Amoeba

کہ نباتات میں ہو یا حیوانات میں ، ارتقا کا عمل کسی نوع یا صنف میں اسی وقت ظہور پذیر ہو سکتا ہے جب اس میں نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی قوت موجود ہو ۔ محض نئے ماحول میں ہونا کافی نہیں ، محض نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی خواہش بھی کافی نہیں ۔ بلکہ نئے ماحول کی مبارزت[1] کا مقابلہ کرنے کی قوت ہونا بھی ضروری ہے ۔ اگر یہ قوت موجود نہ ہو تو نوع نئے ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتی اور ختم ہو جاتی ہے ۔ یہ قوت نوع کی اصل یا جڑ سے حاصل ہوتی ہے ۔ پودے کی نئی شاخ پھوٹنے کے بعد نوع نئے ماحول میں پہنچتی ہے تو وہ اسی وقت زندہ رہ سکتی ہے اور ترقی کر سکتی ہے ، جب اس کے جسم میں نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی قوت پہلے سے موجود ہو ، ورنہ وہ نوع ختم ہوجائے گی ۔ اس اصول کا اطلاق تہذیب و تمدن کے ارتقا پر کیا جائے تو ظاہر ہو گا کہ کوئی تہذیب کسی دوسری تہذیب سے اسی وقت مطابقت پیدا کرسکتی ہے یا اس سے استفادہ کر سکتی ہے جب اس تہذیب کی اپنی جڑیں مضبوط ہوں ۔ اگر کسی قوم کی تہذیب کی اپنی جڑیں مضبوط نہیں یا وہ ان جڑوں کو چھوڑ چکی ہے

Challenge - 1

تو اس میں تہذیبی قوت باقی نہیں رہے گی اور یہ نئی تہذیب اور نئے ماحول سے مطابقت کی کوشش سے بہ وجوہ ختم ہو جائے گی ۔ اس لیے تہذیبی ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ قوم کی اپنی تہذیبی روایات کا شعور برقرار رہے ۔ کیوں کہ کسی قوم کی تہذیبی طاقت کا سرچشمہ خود اس کی اپنی تہذیب ہی میں مل سکتا ہے ، کسی دوسری قوم کی تہذیب میں نہیں مل سکتا ۔ چنانچہ جو قومیں اپنی تہذیب کا شعور نہیں رکھتیں وہ کسی دوسری تہذیب کی روح سے آشنا نہیں ہو سکتیں ، البتہ اس کی سطحی حیثیت سے ضرور آگاہ ہو سکتی ہیں ۔ جو لوگ اپنی زبان ، اپنے فن ، اپنی روایات فکر کو بھول جاتے ہیں ، انہیں حقارت سے دیکھتے ہیں یا ان کی طرف توجہ نہیں دیتے ، وہ کسی دوسری ترقی یافتہ تہذیب سے بھی استفادہ نہیں کر سکتے ۔

نو آزاد اور پسماندہ اقوام کے لیے تیزی سے بدلتے ہوئے نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنا اور صحیح بیرونی اثرات قبول کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے تہذیبی سرمائے کو برقرار رکھنا اور اسے ترقی دینا ۔ ان دونوں صورتوں میں سے اگر ایک کو دوسرے کی خاطر قربان کر دیا گیا تو یہ قومیں اسی تیز رفتاری کے ساتھ وامانده ، پسماندہ اور مفلوک الحال ہوتی چلی جائیں گی جس رفتار سے طاقتور قومیں ترقی کر رہی ہیں ۔

اس لیے ایک اور اہم حقیقت جسے ہمیں پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے ، یہ ہے کہ اس دور میں ترقی یا تبدل کی رفتار اتنی تیز ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے جس کا کبھی پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ اس کی مثالیں اس مقدمے میں دی جا چکی ہیں ۔ اس تیز رفتاری کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ یہ دور دنیا کی قدیم تہذیبوں کا نہیں ہے کہ انسان خاموشی سے دوسروں کا تماشا دیکھتا رہے اور خود کچھ نہ کرے ۔ اس دور میں آنکھ جھپکنے میں کارواں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ بیسویں صدی سے چونکہ پسماندہ قوموں کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے اس لیے ان قوموں کے مفکرین پر بہت اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ ان کی فکر بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے شروع میں پسماندہ قوم کے مستقبل کی طرف نشان دہی کرے گی ۔ بیسویں صدی کے ختم ہونے میں اب صرف تینتیس سال باقی ہیں ۔ اس مدت میں بہت کچھ ہو سکتا ہے ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تقریباً اتنی ہی مدت میں نئے تصورات حقیقت بن گئے (ہوائی جہاز ، ایٹم بم وغیرہ) اور اب تو انسانی فکر و عمل کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی ہے ۔ اب بعض جنگوں کا فیصلہ صرف ایک گھنٹے میں ہو جاتا ہے ۔ طاقت ور قوموں کی حکمت عملی میں آٹھ دس سال کے عرصے میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا ہے ۔ بین الاقوامی

سیاست کے متضاد فلسفے کبھی برسرپیکار نظر آتے ہیں اور کبھی پر اسرار طور پر ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس نبتشس سال میں یہ نظریاتی حالت کیا شکل اختیار کرے گی؟ کمزور، مفلس اور پسماندہ اقوام اس سے کس طرح متاثر ہوں گی؟ آج طاقتور قومیں کمزور قوموں کی مدد کر رہی ہیں۔ ممکن ہے ایک وقت ایسا آئے کہ سب طاقتور قومیں (جن میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو بیسویں صدی ہی میں طاقتور قوموں میں شامل ہوئی ہیں) اس بات پر متحد ہو جائیں کہ جو قومیں اپنی مدد آپ نہیں کر سکتیں اور جن میں نمو اور ارتقا کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، ان کا اب کوئی مصرف نہیں رہا، ان کی مدد کرنا بے سود ہے۔ انھیں آہستہ آہستہ اپنی موت مرنے دیا جائے (ارتقا کا اصول بھی اتنا ہی بے رحم ہے)۔ یہ تصور اس وقت بہت بھیانک معلوم ہوتا ہے لیکن محال نہیں۔ کاش یہ اندیشہ غلط ثابت ہو لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ پسماندہ اقوام کی فکر مستقبل کے تمام امکانات کا احاطہ اور تجزیہ کرتی رہے۔ لہذا اس دور میں فکر کا رخ ماضی کے پس منظر میں حال اور مستقبل کے حقائق کی طرف ہونا چاہیے بشرطیکہ اس فکر کی بنیادیں کسی جذباتی قسم کی خوش فہمی (utopia)

پر نہیں بلکہ عقلیت اور تجربیت کی مدد سے حقائق (جن میں تلخ حقائق بھی شامل ہوں) کے تجزیے پر رکھی جائیں جو ہمارے سامنے ہیں اور بہت تیزی کے ساتھ سامنے آتے جا رہے ہیں ۔ انداز فکر کی یہ تشکیل جدید ہر قسم کی عصبیت اور کوتاہ اندیشی سے پاک ہونی چاہیے ۔ ہمیں افکار کے اُن سرچشموں سے بھی مدد لینی ہو گی جو معاشرتی روایات میں موجود ہیں اور اُن ماخذ سے بھی استفادہ کرنا ہو گا جو فکر مغرب سے ہمیں مل سکتے ہیں ۔ اگر ہم نے بہت جلد صحیح اور حقیقت پسندانہ انداز فکر اختیار نہ کیا تو اس کے مہلک نتائج اس قدر تیزی کے ساتھ ظاہر ہو جائیں گے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی ۔

شاعر مشرق علامہ اقبال پسماندہ اقوام کے لیے یہ پیغام چھوڑ گئے ہیں :

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اردو کی بابت فرانسیسیوں کی چند تحریریں

"لوئی چہاردہم کا عہد یونانی اثرات کا عہد تھا ،
ہمارا زمانہ مشرقی اثرات کا زمانہ ہے ۔"
وکٹر اوگو
جنوری ، ۱۸۲۹ع
(از دیباچۂ بیاض مشرق "LES ORIENTALES")

اردو زبان کے بارے میں غلط فہمیاں :

اکتوبر ، ۱۹۶۲ع میں حکومت فرانس کی طرف سے مجھے اسکالر شپ ملا ، اور حکومت پاکستان نے فرانس کی سول سروس کا مطالعہ اور ریسرچ کرنے کے لیے مجھے پیرس بھیجا ۔ سول سروس پر کام کرنے کے لیے میں حکومت فرانس کے دفاتر ، اداروں اور کتب خانوں میں گیا[1] ۔ اس کام کے سلسلے میں پیرس کے مشہور کتب خانے ببلیوتک ناسیونال میں اکثر جانا ہوا ۔ اس کتب خانے میں مشرقی زبانوں کے مخطوطات اور کتب کے لیے ایک

---

(۱) یہ مضمون دسمبر ، ۱۹۶۳ع میں پیرس میں لکھا گیا ۔

علیحدہ شعبہ ہے ۔ جب میں اس شعبے میں گیا تو مجھے دو چیزیں دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا ؛ ایک تو یہ کہ پاکستان کو علیحدہ ملک تصور نہیں کیا گیا تھا ؛ "ہندوستان" کے شیلف میں ہندوستان کے بارے میں کئی موضوعات مثلاً آرٹ ، کلچر ، تاریخ ، مذہب ، سیاسیات وغیرہ کے بارے میں کارڈ رکھے ہوئے تھے ، اور ان موضوعات میں ہندوستان کا ایک موضوع 'پاکستان' بھی تھا جس کے بارے میں کارڈ ہندوستان کے شیلف میں رکھے ہوئے تھے ۔

دوسری بات یہ تھی کہ اردو زبان کے متعدد مخطوطات فہرست میں شامل تھے، لیکن انھیں بنگالی ، سنسکرت وغیرہ زبانوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا ؛ اردو کا نام کہیں نہیں لکھا گیا تھا ۔ اردو مخطوطات کے بارے میں صرف یہ لکھ دیا گیا تھا کہ یہ فارسی رسم الخط میں لکھے گئے ہیں ۔

جب میں نے شعبے کے ڈائریکٹر کی توجہ اس طرف دلائی تو انھوں نے 'ماہر ہندوستانیات' کی رائے طلب کرنے کے بعد مجھے جو جواب دیا وہ یہ تھا :-

"پاکستان سیاسی طور پر ہندوستان سے علیحدہ ہے لیکن جغرافیائی حیثیت سے علیحدہ نہیں ہے ۔ اور ہم تمدن کے اعتبار سے ہندوستان اور

پاکستان کو ایک ہی تصور کرتے ہیں ۔
جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے ، ہمارے
ماہرِ ہندوستانیات کی رائے یہ ہے کہ اردو
اور ہندی دراصل ایک ہی زبان کے دو نام
ہیں ؛ اردو کوئی علیحدہ زبان نہیں ہے ؛ اس لیے
اس کے مخطوطات کی علیحدہ فہرست مرتب
کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ۔"

میں نے پاکستان اور اردو زبان کے صحیح موقف کے بارے میں ڈائریکٹر (موسیو توما) اور ماہر ہندوستانیات (موسیو پولی) کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی اور مجھے خوشی ہوئی کہ ان حضرات نے آخر کار میری وضاحت سے اتفاق کر لیا ۔ پاکستان کو ببلیوتک ناسیونال میں پہلی مرتبہ ایک علیحدہ موضوع کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا اور اس کے بارے میں تمام مضامین کے کارڈ ایک علیحدہ شیلف میں رکھ دیے گئے ۔ چوں کہ ماہر ہندوسانیات موسیو پولی اردو نہیں جانتے اس لیے میں نے نہ صرف اردو مخطوطات کی علیحدہ فہرست مرتب کردی بلکہ ہر مخطوطے پر علیحدہ نوٹ بھی لکھ دیے جو کتابی صورت میں علیحدہ شائع ہو رہے ہیں ۔ مخطوطات پر میرے نوٹ کو کتب خانے کی 'فہرست مخطوطات' میں شامل کر لیا گیا ہے ۔

اردو زبان کے بارے میں مشرق شعبے کے ارکان کی رائے دو غلط فہمیوں کی وجہ سے تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی زبان دراصل ہندی تھی نہ کہ اردو ، جو ناگری رسم‌الخط میں لکھی جاتی تھی ؛ اصل زبان ہندی ہی ہے ۔ دوسری غلط فہمی یہ تھی کہ آزادی سے پہلے کے ہندوستان کی زبان بھی ہندی زبان تھی نہ کہ اردو ۔

ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے میں نے کوشش کی کہ اپنی رائے ، یا اردو کے ہندوستانی یا پاکستانی حامیوں کی رائے کے بجائے اگر ممکن ہو تو فرانسیسیوں کی رائے ارباب شعبۂ مشرق کے سامنے پیش کروں ۔ چناں چہ اس کوشش میں میں نے مشرق زبانوں کے بارے میں فرانسیسی کتابوں کی تلاش اور مطالعے کا کام شروع کیا ۔ زیر نظر مقالے میں میں چند اُن تحریروں کا ذکر کروں گا جو تحقیق کے سلسلے میں مجھے ملیں ۔ ان کا ذکر میں اسی ترتیب سے کروں گا جس طرح سے یہ میری نظر سے گزریں ۔

گارسیں دتاسی :

یہ فطری امر تھا کہ سب سے پہلا میرا خیال اردو زبان کے اس محسن کی طرف جائے جس کے احسان کو اردو کے چاہنے والے کبھی نہیں بھول سکتے ۔ گارسیں دتاسی

کی ۳۴۲ تصنیفات (کتابیں ، رسالے ، مقالے وغیرہ) میں سے بیش تر پیرس میں موجود ہیں ۔ لیکن گارسیں دتاسی[1] کی اردو سے محبت اس قدر مشہور بلکہ 'بدنام' ہوچکی ہے کہ اس کی رائے کو ایک جانب دار کی رائے سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس لیے میں نے اس کی کتابوں کے حوالے ارباب شعبۂ مشرق کے سامنے پیش کرنے ضروری خیال نہیں کیے ۔ صرف ایک مختصر سے اقتباس کو کافی سمجھا ۔ لیکن اس اقتباس کے الفاظ میں کتنی جان ہے اس کا اندازہ قارئین کرام خود فرمائیں ۔

اپنی کتاب 'Origine Et Diffusion De L' Hindustani کے صفحہ ۳۲۰ پر گارسیں دتاسی ہندوستانیوں کو خبردار

---

(۱)۔ Garcin De Tassy کو اردو میں میں عموماً گارساں دتاسی لکھا جاتا ہے جو صحیح نہیں ۔ فرانسیسی زبان میں cin کو 'سیں' بولا جاتا ہے ، 'ساں' نہیں ۔ ('ساں' کے لیے فرانسیسی حروف 'can' ہوں گے) چناں چہ دیوان ولی جو پیرس میں انیسویں صدی میں شائع ہوا تھا اس میں مرتب کرنے والے کا نام 'غارسیں دتاسی' لکھا گیا ہے ۔ 'g' کے لیے اردو میں 'گ' موجود ہے اس لیے گارسیں دتاسی صحیح ہوگا ۔ گارسیں دتاسی کا مرتب کیا ہوا دیوان ولی ببلیوتک نیسونال پیرس میں موجود ہے ۔ اس کا ایک نسخہ ترقی اردو بورڈ کراچی میں بھی ہے ۔

کرتا ہے کہ "نفاق پیدا کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی کو انگریز حکومت پورے طور سے استعمال کرے گی۔ اس سلسلے میں مزید لکھتا ہے :-

"(اردو اور ہندی) کے اختلاف کو انگریز حکام اپنی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے استعمال کریں گے اور اس طرح ہندو اور مسلمان آخرکار بالکل علیحدہ ہو جائیں گے کیوں کہ قوموں میں کوئی چیز اس قدر اختلاف پیدا نہیں کرتی جتنا یہ کہ ان کی زبانیں مختلف ہوں۔ اور کوئی چیز اتنا اتحاد اور یگانگت پیدا نہیں کرتی جتنی کہ ایک مشترک زبان۔ یہ حقیقت اس قدر عیاں ہے کہ اس کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں۔"

گارسیں دتاسی نے یہ پیشین گوئی تقریباً سوا سو سال

ہوئے کی تھی، ہم نے دیکھ لیا کہ یہ صحیح ثابت ہوئی۔ مشترک قومی زبان کا مسئلہ مشرق اور مغربی پاکستان میں تو کیا، ابھی خود مغربی پاکستان میں حل طلب ہے۔ جو لوگ مشترک زبان کی اہمیت کو ابھی نہیں سمجھے وہ غالباً اس خطرے کو دعوت دے رہے ہیں جس کی طرف گارسیں دتاسی نے اشارہ کیا تھا۔

عالمی زبانوں کے ماہرین کی رائے :

ببلیو تک ناسیونال کے مشرقی زبانوں کے شعبے میں دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کی لسانیات پر ایک کتاب Les Langues Du Mondes موجود ہے ۔ اس کتاب میں زبانوں کی تاریخ ، خصوصیات ، صوتیات اور رسم الخط وغیرہ پر تحقیقی مقالے ہیں ۔ ہندوستانی کے بارے میں صفحہ ۲۳ پر لکھا ہے :-

"مغربی ہندی زبان بہت اہم ہے کیوں کہ اس کی اصل بولی ہندوستانی ہے ۔ یہ اصطلاح (ہندوستانی) مروج کر دی گئی ہے لیکن دراصل ہندوستان کی نہیں ہے ۔ یہ اصطلاح انگریز گل کرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں اس زبان کے لیے وضع کی تھی جو میرٹھ کے شمال میں پیدا ہوئی اور جو عوام اور قلعۂ دہلی کی زبان بنی اور جسے شمالی ہند میں بولا جاتا ہے ۔ اس زبان کا ادب بھی ہے ۔ اس زبان کو اردو بھی کہتے ہیں جس کے لفظی معنی فوجی کیمپ کے ہیں ۔ یہ عربی حروف میں لکھی جاتی ہے اور اس میں بیش تر الفاظ فارسی زبان کے ہیں ۔ اس زبان کو ابتدا میں مسلمانوں

اور ہندوؤں نے استعمال کیا جو فارسی کے
زیر اثر تھے ۔
ہندوستانی زبان کی ایک دوسری شکل ہندی
ہے جو ہندی(ناگری)حروف میں لکھی جاتی ہے ۔
یہ اردو کے خلاف ایک رد عمل کا اظہار ہے ۔

اس زبان میں سنسکرت کے الفاظ بہت زیادہ ہیں۔"

اس اقتباس کی ابتدا میں کچھ متضاد باتیں کہی گئی ہیں لیکن آخر میں مصنفین نے حقیقت حال نہایت صاف الفاظ میں بیان کر دی ہے ۔ اس میں میں نے اس جملے کی طرف کتب خانے کے ارکان کی خاص توجہ دلائی ، جس کے نیچے میں نے خط کھینچ دیا ہے اور انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ہندوستانی زبان اردو ہی تھی اور اردو ہی رہتی اگر "رد عمل" کے طور پر اسے ناگری حروف میں لکھنے کی مہم شروع نہ کی جاتی ۔

ایک سیاح کی نوٹ بک :

ببلیوتک ناسیونال پیرس کے اردو کے مخطوطات میں ایک نوٹ بک میری نظر سے گزری ۔ یہ نوٹ بک شارل دوشوا (Charles d' Ochoa) کی ہے[1] ۔ دوشوا کے بارے

---

(۱) ۔ ببلیوتک ناسیونال پیرس ، اردو مخطوطات کیٹلاگ نمبر ۸۳۲ ۔

میں زیادہ معلومات مجھے نہ مل سکیں ۔ نوٹ بک سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دوشوا ایک سائنٹفک مشن کا انچارج تھا جسے حکومت فرانس کے وزیر تعلیم نے ۱۸۴۴ء میں ہندوستان بھیجا تھا ۔ یہ نوٹ بک کافی دل چسپ ہے ۔ اس نوٹ بک کے صفحہ ۱۴۷ پر دوشوا نے اردو قواعد لکھنی شروع کی ، لیکن صرف ایک صفحہ لکھا ۔ ابتدائی نوٹ کا ترجمہ یہ ہے :-

"ہندوستانی زبان کو ہندی ، اردو اور ریختہ بھی کہتے ہیں ۔ یہ زبان ہندی اور برج بھاشا سے بنی ہے جو اب بھی بعض جگہ بولی جاتی ہے ۔ مثلاً قنوج میں جو ایرانی اور عرب فاتحین کا دارالحکومت تھا ۔ ہندوستان کے جزیرہ نما کے مغرب میں ہندوستانی نئی دکھنی زبان بولی جاتی ہے جو عربی اور دیوناگری دونوں حروف میں لکھی جاتی ہے لیکن زیادہ تر عربی رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے ۔ دیوناگری رسم الخط صرف برج بھاشا اور ہندوی بولیوں کو لکھنے وقت استعمال کیاجاتا ہے ۔"

اردو قواعد کے مخالفین کے جواب میں :

اردو مخطوطات میں ایک فرانسیسی اردو ڈکشنری'

ہے جسے اوساں (Aussant) نے ۱۷۸۴ء میں لکھا تھا[1]۔

اس ڈکشنری کے شروع میں نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اوساں بنگال میں شاہی مترجم تھے۔ انھوں نے اردو زبان سیکھنے میں کافی کاوش کی تھی۔ چناں چہ مخطوطات میں ایک کتاب موسومہ 'کتاب آموز المنشی' بھی ہے جو اوساں کے لیے ۱۷۸۲ء میں لکھی گئی تھی اور جس میں فارسی اور اردو زبان سکھانے کے لیے قواعد، الفاظ، محاورے، کہانیاں وغیرہ درج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اوساں نے زبان سیکھنے کے لیے بہت کاوش کی اور صرف دو سال کے عرصے میں زبان پر اس قدر عبور حاصل کر لیا کہ ۱۷۸۴ء میں 'فرانسیسی اردو ڈکشنری' لکھ دی۔

اس ڈکشنری کے شروع میں ایک طویل نوٹ ہے جس میں اوساں نے اردو زبان کے اُن مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو کہتے تھے کہ اردو زبان اس قابل نہیں کہ اس کی قواعد وغیرہ بنائی جا سکے۔ اوساں کے نوٹ کا خلاصہ یہ ہے:-

"گریمر کے بغیر کسی زبان کو سیکھنے کی

(۱)۔ ببلیوتک ناسیونال پیرس، فہرست اردو مخطوطات نمبر ۸۴۳۔

کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص موسیقی کے اصول سے واقف ہوئے بغیر کوئی ساز بجانا شروع کر دے ..... اردو زبان پر جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس زبان میں قواعد کے اصول متعین کیے جانے کی صلاحیت نہیں ہے ۔ اور یہ کہ اردو زبان فارسی زبان سے اس قدر منسلک ہے کہ اسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ خیال بالکل غلط ہے ۔ اردو زبان میں قواعد کے اصول متعین کیے جانے کی پوری صلاحیت ہے ، اور اگر کوئی شخص اردو اور فارسی کی زبانیں سیکھنا چاہے تو بہتر ہوگا کہ وہ اردو قواعد سے ابتدا کرے ۔ اس اعتراض میں بھی کوئی جان نہیں کہ اردو میں فارسی کے الفاظ کی بہتات ہے اس لیے اردو سیکھنے کی ضرورت نہیں ، صرف فارسی کافی ہے ۔ انگریزی زبان میں یونانی الاصل الفاظ کی بہتات ہے لیکن اس کے باوجود انگریزی زبان پر یہ اعتراض نہیں کیا جاتا ۔ اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ جو فارسی الفاظ اردو میں آگئے ہیں وہ زیادہ تر اردو

قواعد کے اصولوں کے لحاظ سے استعمال
ہوتے ہیں نہ کہ فارسی قواعد کے اصولوں کے
لحاظ سے۔"

میں نے اوساں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے لیے مزید وقت کی ضرورت ہے۔ میں نے ببلیوتک ناسیونال کے ماہر ہندوستانیات سے کہا ہے کہ وہ اوساں کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔

اردو کی قدیم ترین لغت :

اسی کتب خانے کے مشرق شعبے میں مجھے ایک لغت ملی۔ یہ لغت چار زبانوں لاطینی ، ہندی ، فرانسیسی اور اردو میں لکھی گئی تھی۔ اس لغت کے پیرس میں آنے کی داستان دل چسپ ہے۔ مخطوطے کے شروع میں ایک نوٹ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

"۱۷۵۸ء میں میں سورت میں تھا اور
پہلوی زند کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ مقامی
پارسی عالموں سے بات چیت کرنے کے لیے جدید
فارسی زبان استعمال کرتا تھا لیکن روزمرہ کی
گفتگو کے لیے اور سورت اور ہندوستان کے
دوسرے علاقوں مثلاً کارومنڈل ، مالابار ، بنگال
وغیرہ میں سیر و سیاحت کے لیے مور (Maure)

یا ہندوستانی زبان بولنا پڑتی تھی ۔

میں نے سورت میں ایک کاپوچین مشنری کے ہاں ایک پرانا لیکن نہایت بیش قیمت مخطوطہ دیکھا ۔ یہ ایک 'مور۔ فرانسیسی' لغت تھی ۔ میرا ارادہ تھا کہ اس کی نقل کر لوں لیکن میری علالت ، مصروفیات اور سورت میں بعض دیگر پریشانیوں کی وجہ سے میں یہ کام نہ کرسکا ۔ اس کے بعد مجھے سخت افسوس رہا کہ میں نے اس بیش قیمت لغت کی نقل نہ کی ۔ آخر ۱۷۷۸ع میں میں نے ایک کتاب (Alphabetum Brahmanicum) دیکھی جو ۱۷۷۱ع میں روم سے شائع ہوئی تھی ۔ اس کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ روم کے صیغۂ تبلیغ و اشاعت کے کتب خانے میں ہندوستانی زبان کی لغت کا ایک نسخہ موجود ہے جو سورت میں ایک مشنری نے لکھا تھا ۔ اس نسخے کے بارے میں جو تفصیل تحریر کی گئی تھی اس سے مجھے شبہ ہوا کہ غالباً یہ وہی مخطوطہ یا اس کی نقل تھی جو میں نے سورت میں دیکھا تھا ۔

پاپائے روم کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں

ایک ہندوستانی ڈکشنری لکھنا چاہتا تھا ، موصوف نے مربیانہ مدد فرمائی اور ۱۴ اکتوبر ، ۱۷۸۳ع کو یہ مخطوطہ ملا ۔ اس عنایت خسروانہ نے میری بے انتہا ہمت افزائی کی اور میری رگوں میں جوانی کا خون دوڑا دیا اور مجھے ایک بار پھر وہی جوانی کی طاقت بخش دی جس کے بل بر میں نے ہندوستان کے قیام کے دوران میں مغربی ساحل کے دشوار گزار گھاٹوں کا سفر کیا تھا ۔ باد و باراں اور طوفانوں کی مصیبتیں برداشت کی تھیں اور تمام مشکلات کا مقابلہ کرکے تین مردہ زبانیں زند ، پہلوی اور سنسکرت سیکھی تھیں ۔

اور میں نے اس پورے مخطوطے موسومہ 'ہندوستانی زبانوں کا خزانہ[۱]' کو نقل کر لیا ۔ اور یہ احتیاط برتی کہ اصل و نقل میں ایک نقطے کا بھی فرق نہ رہے ۔ چناں چہ میں نے نقل کا اصل مخطوطے سے تین مرتبہ مقابلہ کیا ۔ یہ کتاب اس لغت کی بنیاد ہوگی جو میں لاطینی ، فرانسیسی ، مور ، فارسی ، فرانسیسی اور

Thsaurus Linguae Indianae - (۱)

لاطینی میں مرتب کر رہا ہوں'۔"

اس کے بعد اس مخطوطے کے بارے میں کچھ تفصیلات درج ہیں ۔ آخر میں لکھا ہے ۔

" . . . جناب پاپائے روم کا یہ فیصلہ کہ یہ مخطوطہ میرے پاس پیرس میں بھیج دیا جائے یورپ کے لیے ایک مثال ہے اس امر کی کہ تمام اہل علم ایک خاندان کی طرح ہیں ۔ میں استدعا کرتا ہوں کہ موصوف اس لطف و کرم کے لیے میرا سپاس عقیدت قبول فرمائیں ۔

پیرس ، ۱۰ ۔ مارچ ، ۱۷۸۴ع
انکتل دوپرون (Anquetil Duperron) سیاح ،
رکن اکادمی ادبیات عالیہ و مترجم شاہی برائے
السنۂ مشرقیہ ۔"

---

(۱) ۔ افسوس ہے انکتل دوپرون اپنے ارادے کی تکمیل نہ کرسکا اور یہ لغت نہ لکھ سکا جس کا غالباً سبب یہ ہے کہ پانچ سال بعد یعنی ۱۷۸۹ع میں انقلاب فرانس رونما ہوا اور اس کے بعد ہنگامی حالات نے اسے اس کام کی مہلت نہ دی ۔ ۱۸۰۵ع میں دوپرون کا انتقال ہوگیا ۔

دوپروں نے اپنے نوٹ میں چند اور اہم باتیں بھی بیان کی ہیں ۔ اس نے لکھا ہے کہ اس لغت کا اصل نسخہ جو سورت میں لکھا گیا تھا، ۱۷۰۴ع میں روم کے شعبۂ تبلیغ و اشاعت کے کتب خانے میں داخل کیا گیا ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ لغت سترھویں صدی میں لکھی گئی تھی ۔ دوپروں کو جب یہ نسخہ ۱۴/اکتوبر، ۱۷۸۳ع کو پیرس میں ملا تو اس کی عمر ۵۲ سال کی تھی[1] ۔ اس عمر میں بھی اس نے اس کام میں بہت ہمت کا ثبوت دیا اور صرف پانچ مہینے میں اس ضخیم لغت کی نقل کی اور اس کا اصل نسخے سے تین مرتبہ مقابلہ کیا ۔ اس کے بعد اصل نسخہ وزیراعظم وقت کونت ورژن کو واپس کر دیا تاکہ وہ اسے روم واپس بھیج دیں ۔

اس لغت کی اہمیت تاریخی حیثیت کے علاوہ عملی بھی ہے ۔ اس وقت کوئی فرانسیسی اردو لغت موجود نہیں ہے ۔ میں نے پیرس میں ڈاکٹر حمیداللہ سے کہا تھا کہ وہ ایک فرانسیسی اردو لغت تیار کرنے کے بارے میں

---

(۱) ۔ دوپروں کی تاریخ پیدائش ۷/ اکتوبر، ۱۷۳۱ع بیان کی گئی ہے ۔ ملاحظہ ہو کتاب Voyage Aux Indes Orientales ۔ مصنفہ الکتل دوپروں صفحہ ۸ ۔ بیلیوتک ناسیونال پیرس ۔ کیٹلاگ نمبر (O.K2 104)

غور فرمائیں ۔ لیکن انھوں نے معذرت کی اور کہا کہ انھوں نے کچھ کام اپنے سر لیے ہیں اس لیے اس کے لیے وقت نکالنا ممکن نہ ہوگا ۔ بہر حال ببلیوتک ناسیونال کے اس مخطوطے کو 'فرانسیسی اردو ڈکشنری' کی اساس کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ چار مشرق اور مغربی زبانوں میں اس پائے کی لغت شاید ہی دنیا میں کہیں اور موجود ہو ۔ کاش اردو زبان کے قدردان اس طرف توجہ کریں ۔

اس لغت کو دیکھ کر مجھے دوبروں کی شخصیت سے دل چسپی پیدا ہو گئی اور مجھے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی جستجو ہوئی ۔ چناں چہ میں نے ببلیوتک ناسیونال کے صیغۂ مطبوعات (مغربی) اور ایکول ناسیونال دے لانگزو غیانتال ویوانت پیرس کے کتب خانوں میں دوپروں کے حالات کی تلاش شروع کی ۔ مجھے خوشی ہوئی کہ مجھے نہ صرف دوبروں کی زندگی کے دل‌چسپ حالات مل گئے بلکہ اس کی تصانیف بھی مل گئیں ۔ مشہور فرانسیسی محقق دوگا نے لکھا ہے[1] :

---

(۱) ۔ ملاحظہ ہو : Dugat (Gustave) کی کتاب Histoire Des Orientales _ de L' Europe du XVIII IX Siecle"
(کتب خانہ ایکول ناسیونال دے لانگزو غیانتال ویوانت پیرس) ، صفحہ ۲۹ ۔

"نوجوانی کے زمانے میں زند زبان کے چند مخطوطات انکتیل دوپروں کے ہاتھ لگ گئے۔ اس نوجوان کو یہ زبان اور دیگر مشرقی زبانیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ آخر کار یہ بحریہ میں بھرتی ہوکر ہندوستان آگیا، جہاں اس نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ زند زبان سے پارسیوں کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اپنشد کے ایک فارسی نسخے سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات وغیرہ پر تحقیق کی۔ جب واپس فرانس آیا تو دوپروں مال و زر کے اعتبار سے خالی ہاتھ تھا، لیکن قدیم ہندوستانی مخطوطات کا ایک بیش قیمت خزانہ مخطوطات کی صورت میں اپنے ساتھ پیرس لایا اور ان مخطوطات کو شاہی کتب خانے (جسے اب ببلیوتک ناسیونال کہتے ہیں) میں داخل کیا۔ اور ہندوستان کے بارے میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد وہ مشرقی زبانوں کے لیے شاہی مترجم مقرر ہوا اور اس کے بعد فرانس کی اعلیٰ ادبیات کی اکادمی کا رکن منتخب ہوگیا۔ ۱۸۰۵ع میں پیرس میں اس کا

انتقال ہوا ۔"

انکتیل دوپروں کی زندگی میں اور بہت سے حالات کافی دل چسپ ہیں ۔ مثلاً یہ کہ انگریزوں نے پچاس ہزار فرانک کی رقم دوپروں کو زند زبان کے اس مخطوطے کے لیے پیش کی جس سے اس نے پارسیوں کی مذہبی کتاب کا ترجمہ کیا تھا ، لیکن دوپروں نے یہ پیش کش قبول نہ کی ۔ اس کی تصنیفات بھی بہت دل چسپ ہیں ۔ اس نے اپنی کتابوں میں اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی سیاست پر بہت محققانہ بحثیں کی ہیں ۔ زبان کے بارے میں اس کا ایک بیان نقل کرتا ہوں ۔ اپنی کتاب 'ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ پر تحقیقات' میں دوپروں لکھتا ہے[۱] :

"ہندوستان میں اس وقت سب سے زیادہ اہم زبان جسے کافی حد تک عمومیت حاصل

---

(۱) ۔ ملاحظہ ہو "Recherches histoirique et Geographique "Sur l'Inden" بلیوتھک ناسیونال پیرس ۔ کیٹلاگ نمبر (O²K 27) ۔ صفحہ نمبر ۱۰ ۔ اسی کتاب کا ایک اور نسخہ کیٹلاگ نمبر O² K 1136 بھی موجود ہے ۔ یہ نسخہ شاہی محل Fontainblue کے کتب خانے سے حاصل کیا گیا تھا ۔ اس نسخے میں کچھ صفحات غائب ہیں اور وہ حصہ بھی غائب ہے جس میں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں لکھا گیا ہے ۔ اس لیے محققین کیٹلاگ نمبر O² K 271 ملاحظہ فرمائیں ۔

ہے جدید فارسی زبان ہے ۔ ہندوستان کے
نواب ، ان کے وزرا اور ان کے سیکریٹری یہی
زبان بولتے اور لکھتے ہیں ۔ یہ زبان مال دیپ
اور مشرق ساحل میں بھی بولی جاتی ہے۔
فارسی کے ساتھ ساتھ دوسری زبان 'ہندوستانی'
(Industani) ہے جو شمال سے لے کر
خلیج بنگال ، کھمبایت ، دکن اور دونوں
ساحلوں میں بولی جاتی ہے۔ یورپینوں نے اسے
'مور' (Maure) کا نام دیا ہے ۔ 'ہندوستانی'
ناگری (سنسکرت) حروف میں بھی لکھی
جاتی ہے اور فارسی حروف میں بھی ۔ فارسی
حروف میں لکھتے وقت بعض حروف میں کچھ
نقطوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے ، تاکہ تلفظ
میں وہ آوازیں نکالی جا سکیں جن کے لیے
فارسی زبان میں حروف موجود ہیں ۔ اس
زبان میں عربی ، فارسی ، ترکی ، بنگالی ،
مرہٹی وغیرہ سب زبانوں کے الفاظ موجود
ہیں . . . . "

اسی باب میں دوپروں نے ہندوستان کی لسانی تقسیم کے بارے میں بھی لکھا ہے اور اپنی ایک اور کتاب میں ایک اسکیم پیش کی ہے جس میں دوپروں نے تجویز کیا ہے

کہ "فرانس کی ہندوستان کے ساتھ تجارت کو فروغ دینے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے اور اس ادارے میں جو فرانسیسی نوجوان ملازم رکھے جائیں انھیں ہندوستان کی زبانوں اور تمدن کی ٹریننگ باقاعدہ طور پر دلائی جائے۔"

اردو زبان کی مخالفت میں ایک رائے :

پیرس کا ایکول ناسیونال دے لانگزو ضیانتال ویوانت (زندہ مشرق زبانوں کا قومی مدرسہ) جسے فرانسیسی مختصراً 'لانگزو' بھی کہتے ہیں ، یورپ میں مشرق علوم کا بہت مشہور اور قدیم ادارہ ہے۔ اردو زبان کی تعلیم کے لیے پروفیسر کا عہدہ اس مدرسے میں ۱۸۲۸ء میں قائم ہوا اور اس عہدے پر سب سے پہلے گارسیں دتاسی کا تقرر ہوا۔ اسی زمانے میں ایک صاحب موسیو دوشوم نے ایک مضمون لکھا تھا جو 'لانگزو' میں ایک کتابچے کی شکل میں میری نظر سے گزرا۔ اس مضمون میں موسیو دوشوم (Du Chaume) فرماتے ہیں کہ اردو (ہندوستانی زبان) کی تعلیم کے لیے عہدہ قائم کرنا بے کار ہے ، کیوں کہ اردو زبان کوئی قابل قدر زبان نہیں ہے۔ اس کے ادب میں زیادہ تر تراجم ہیں ، وغیرہ۔ لیکن آخر میں اپنی مخالفت کی ایک دل چسپ وجہ بھی بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں :

"ہمارے مشنری کام کرنے والوں کو یہ زبان

سیکھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیوں کہ
مسلمان جو ہندوستانی زبان بولتے ہیں ، ہمارے
(فرانسیسی) مشنریوں کو تو کیا ، انگریزی
مشنریوں کو بھی اچھی طرح سے تبلیغ کا کام
نہیں کرنے دیتے۔"

پیرس کے قدیم اخبار میں اردو زبان پر تبصرہ :

متذکرۂ بالا مضمون ایک فرانسیسی اخبار 'لمانیتر یونیورسل' مورخہ ۱۶/جون ، ۱۸۲۸ع کے ایڈیٹوریل نوٹ کے جواب میں شائع ہوا تھا ۔ جب میں نے اخبار کا حوالہ دیکھا تو مجھے اس اخبار کی تلاش ہوئی ۔ یہ اخبار 'لائگزو' میں نہ مل سکا ۔ چناں‌چہ میں نے بِبلیوتک ناسیونال میں تلاش کرنا شروع کیا اور اس کتب خانے کے شعبۂ رسائل میں مجھے یہ اخبار مل گیا ۔ 'لمانیتر یونیورسل' پیرس ، مورخہ ۱۶/ جون ، ۱۸۲۸ع کے ایڈیٹوریل نوٹ کا ترجمہ یہ ہے : -

"ایشیائی زبانوں کا مطالعہ جس کے لیے چند سال
سے یورپ میں بہت شوق و ذوق کا مظاہرہ
کیا جارہا ہے ، اب فرانس میں بھی بہت مقبول
ہو گیا ہے اور اعلی حضرت شہنشاہ فرانس
کی حکومت نے اس کی ترویج و ترقی کی طرف

خاص توجہ فرمائی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے
کہ حکومت اُن نوجوانوں کی حوصلہ افزائی
کرنا چاہتی ہے جو علوم و فنون کے اس شعبے
میں دلچسپی لیں ۔ جناب عالی مرتبت
وزیر مملکت امور داخلہ نے اپنے حکم نامہ
مورخہ ۲۹ / مئی کے ذریعے ایک مدرسے کے
قیام کی منظوری دی ہے جو مشرق زندہ زبانوں
کی تعلیم کا خصوصی انتظام کرے گا ۔ اس وقت
کالج فرانس میں ہندوستان کی مدرس زبانوں کی
تعلیم کے لیے ایک اعلی عہدہ اعلیٰ حضرت
شہنشاہ لوئی کی عنایت خسروانہ سے ۱۸۱۴ء
میں قائم ہوا تھا ۔ لیکن اس کے علاوہ ایک
علیحدہ مدرسے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی
جس میں ایشیائی زندہ زبانوں کی تعلیم کا خصوصی
انتظام کیا جا سکے اور اس میں ایک ایسی
زبان کی تعلیم دی جائے جو عربی ، فارسی اور
سنسکرت کے امتزاج سے پیدا ہوئی ، اور جو
چند مقامی تبدیلیوں سے قطع نظر ، تقریباً تمام
ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان ہے ۔ ہندوستان
کے مختلف صوبوں میں تقریباً دس یا بارہ بولیاں
مروج ہیں لیکن ہندوستانی ہی ایک ایسی زبان

ہے جو اس وسیع ملک کے تمام حصوں میں بولنے اور سمجھنے کے لیے کافی ہے ۔ راس کماری سے بخارا تک اور دریائے سندھ کے دہانے سے لے کر دریائے برہم پتر کے گرد و نواح کے علاقوں تک دیگر مقامی بولیوں کی موجودگی کے باوجود ہندوستانی ہی ایسی زبان ہے جسے اس ملک کی قومی زبان (Lingua Franca) کہا جا سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ ہندوستانی زبان میں اصل اور تراجم میں ایسا ادب تخلیق کیا گیا ہے جو یقیناً قابل توجہ اور قابل قدر ہے ۔ مشرق ادب کی خدمت کے پیش نظر جناب عالی مرتبت وزیر داخلہ نے اس زبان کی تعلیم کے لیے موسیو گارسیں دتاسی کا انتخاب فرمایا ہے جو عرصے تک انگلستان میں اس زبان کے مطالعے میں مصروف رہے اور عرصہ پندرہ سال سے ایشیا کی مختلف زبانوں پر نہایت اہم کام کرتے رہے ہیں ، جس کا ثبوت وہ کتابیں ہیں جو موصوف نے ان علوم پر لکھیں اور شایع کیں ۔ ہمیں کوئی شک نہیں کہ موصوف اس ذمے داری کے اہل ہیں جو حکومت نے ان کے سپرد کی ہے ۔

اس تعلیم کا کورس تعطیلات کے فوراً بعد
شروع ہوگا اور اس عرصے میں جناب پروفیسر
صاحب ہندوستانی زبان کی ایک مختصر قواعد
تالیف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں[۱] ۔"

ہندوستانی زبانوں کے شعبے کے صدر کا ایک مقالہ :

پیرس میں اردو زبان کی تعلیم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے میں لانگزو کے پرنسپل (جسے ایڈمنسٹریٹر کہا جاتا ہے) موسیو میرابل سے ملا ۔ موسیو میرابل یونانی زبان اور ادبیات کے ماہر مانے جاتے ہیں ۔ میں نے موسیو میرابل کی خدمت میں وہ کتابیں پیش کیں جو انجمن ترقی اردو نے از راہ کرم مجھے بھیجی تھیں ، اور ان سے کہا کہ میں ان کے مشہور اور قدیم مدرسے پر ایک مقالہ لکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مواد درکار ہے ۔ پروفیسر میرابل بہت خوش ہوئے ۔ مجھے کچھ کاغذات دیے اور باقی مواد بعد میں بھیجنے کا وعدہ کیا ۔ ان کاغذات میں لانگزو میں ہندوستانی شعبے کے صدر پروفیسر پیرمائل کا ایک مقالہ تھا جو موصوف نے ۱۹۴۸ع میں لانگزو کے ڈیڑھ سو سالہ جشن کے موقع پر پیش کیا تھا ۔ اس سے پہلے کہ

---

(۱) ۔ دیکھیے: "Le Moniteur Universal", صفحہ ۸۹۳ کالم ۳ ۔
Paris : Lundi 16 Juin 1828, No 168.

میں اس مقالے میں سے اقتباس پیش کروں ، میں یہ عرض کردوں کہ چند ماہ ہوئے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری پیرس تشریف لائے تھے اور انھوں نے مجھے پروفیسر مائل سے ملایا تھا ۔ پروفیسر مائل ایک نہایت ہنس مکھ قسم کے انسان تھے ۔ ان کا مضمون تامل اور تلگو زبان اور ادب تھا ۔ بنگالی بھی جانتے تھے لیکن اردو سے بہت کم واقف تھے ۔ انھوں نے دوران گفتگو میں کہا کہ میں عرصے سے چاہتا ہوں کہ اردو میں کام کرنے کے لیے اسکالرز پیرس آئیں لیکن ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہوئی ۔ موصوف کو طنز و مزاح سے بھی بہت دل چسپی تھی ۔ جب میں نے کہا کہ میں فرانس کی سول سروس پر کام کر رہا ہوں تو کہنے لگے : "میں 'انتظام مملکت میں مزاح' کے موضوع پر ایک مقالہ لکھ رہا ہوں ، اگر کچھ لطیفے تمھیں یاد ہوں تو مجھے ضرور بتانا ۔" وہ اس روز رخصت پر پیرس سے باہر جارہے تھے ۔ میں نے جلد ملنے کا وعدہ کیا ، لیکن جب وہ رخصت سے پیرس واپس آئے تو چند ہی روز بعد حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہوگیا ۔

پروفیسر مائل نے اپنے متذکرۂ بالا مقالے Les Langue De L' Indie (ہندوستان کی زبانیں) میں سب سے پہلے یورپ میں مشرق زبانوں اور تمدن کے مطالعے کی تحریک کا جائزہ لیا ہے اور 'زندہ مشرق زبانوں کے قومی

مدرسے' کی مختصراً تاریخ بیان کی ہے ۔ اسی سلسلے میں پروفیسر مائل نے وکٹر اوگو کے اس قول کا بھی ذکر کیا ہے کہ "ہمارا زمانہ مشرقی اثرات کا زمانہ ہے ۔" (جس کا حوالہ میں اس مقالے کے شروع میں دے چکا ہوں) اور لکھا ہے[1]:-

"کیا یہ محض اتفاق ہے کہ ہندوستانی زبان کی باقاعدہ تعلیم کا کورس تقریباً اسی وقت شروع ہوا جب وکٹر اوگو کی مشرقی نظمیں "Orientales" شائع ہوئیں ؟ ظاہر ہے کہ یہ محض اتفاق نہیں بلکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مشرق (تمدن) کے مطالعے کی تحریک کتنے زوروں پر تھی ۔"

اس کے بعد گارسیں دتاسی کی خدمات کا ذکر کیا ہے اور اس کی تصنیفات کی اہمیت بیان کی ہے اور آخر لکھا ہے[2]:-

"جہاں تک شمالی ہندوستان سے ہمارے روابط کا تعلق ہے ، وہ گارسیں دتاسی کی موت کے بعد تقریباً ختم ہوگئے ۔ اس کے بعد ہمیں تقریباً کچھ نہیں ملا ؛ نہ زبان و ادب کے بارے میں

---

(۱) ۔ پروفیسر مائل کے مقالے کا صفحہ ۱۱۳ ۔
(۲) ۔ مقالے کا صفحہ ۱۱۹ ۔

نہ تاریخ کے بارے میں ، نہ دوسرے موضوعات
کے بارے میں ۔ عمومی طور پر ہم نے اس
ستر سال میں کوئی ترقی نہیں کی[1]۔"

پروفیسر مائل کی اس تحریر میں جو افسوس ناک حقیقت بیان کی گئی ہے ، وہ قابل غور ہے ۔

ہندوستان کی مختلف زبانوں کے بارے میں اظہار خیال کرنے کے بعد پہلے ہندی ، پھر 'کھڑی بولی' اور پھر اردو کا ذکر کیا ہے اور خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندی زبان ہندوستان کے وسط اور شمال میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے[2]۔ ہندی زبان کے ارتقا کا ذکر کرنے کے بعد اردو کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اس عرصے میں یہی ہندی زبان عربی اور فارسی الفاظ
کے خزانے سے مستفید ہوئی اور اس نے فارسی
رسم الخط اختیار کیا ۔ اس میں ایک نئے ادب

---

(۱) ۔ پروفیسر مائل کا مقالہ ۱۹۴۸ع میں لکھا گیا اور گارسیں دتاسی کی وفات ستر سال قبل یعنی ۱۸۷۸ع میں ہوئی ۔

(۲) ۔ یہاں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ پروفیسر مائل مرحوم (جیسا کہ انھوں نے خود مجھ سے کہا) بنگالی ، تلگو ، تامل اور ہندی وغیرہ جانتے تھے مگر اردو بہت کم جانتے تھے ۔

کی تخلیق ہوئی جو کسی حد تک اسلامی
خیالات سے متاثر تھا اور جس کی وجہ کن
کے شیعہ خاندانوں کی وہ فضا تھی جہاں
ابتدا میں یہ زبان پروان چڑھی۔ اٹھارویں صدی
میں اس کا ادب فارسی ادب کے ساتھ مقبول
ہوا اور ۱۷۸۳ء میں پہلی بار اس کے لیے
'زبان اردو' کا نام استعمال کیا گیا۔ اردو ترکی
زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی 'لشکر' کے
ہیں۔ اب اس زبان کو اردو ہی کہا جاتا ہے[1]۔"

اس کے بعد اردو زبان کی قواعد پر مختصر سا تبصرہ کرنے کے بعد پروفیسر مائل نے لکھا ہے کہ صحت کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اردو زبان ہندوستان کے کس حصے میں بولی جاتی ہے اور کس حصے میں نہیں بولی جاتی، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ زبان صرف مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ زبان برہمن خاندانوں خصوصاً لکھنؤ اور کشمیر میں بھی پروان چڑھی ہے۔ اس کے بعد اردو کے خلاف تحریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کھڑی بولی کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کی ایک

---

(۱)۔ مقالہ صفحہ ۱۲۲۔

اور نئی قسم بھی ظہور پزیر ہوئی ہے ۔ غالباً
اردو زبان کے خلاف تحریک کے سلسلے میں بعض
ہندو لکھنے والوں نے انیسویں صدی میں . . .
ناگری تحریروں میں سے وہ سب الفاظ نکال دیے
جو ان کے نزدیک اسلامی تھے اور ان کی جگہ
خالص سنسکرت کے شدھ الفاظ داخل کر دیے ،
اور اس طرح ایک ایسی زبان وجود میں آئی
جو ایک مخصوص طبقے کے لیے ہے اور کچھ
حد تک بناوٹی معلوم ہوتی ہے[1] ۔"

آگے چل کر ہندوستان کی زبانوں کے ادب کے بارے میں مختصراً تبصرہ کیا ہے اور اردو ادب کے بارے میں لکھا ہے :-

"اردو زبان سترھویں صدی کے دوسرے نصف
حصے میں پیدا ہوئی[2] ۔ اس کی شاعری میں

---

(۱) ۔ مقالہ صفحہ ۱۲۲ ۔

(۲) ۔ بہ ظاہر پروفیسر مائل کا یہ بیان ان کی اس رائے سے مطابقت نہیں رکھتا جو انھوں نے مقالے میں ذرا پہلے ظاہر کی کہ اردو زبان ۱۷۸۳ع میں اردو کہلائی ۔ لیکن غالباً ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ زبان سترھویں صدی میں پیدا ہوئی اور ۱۷۸۳ع میں اردو کہلائی ۔ اردو زبان پندرھویں صدی میں پیدا ہو چکی تھی ۔

کبھی فلسفیانہ خیالات کا اظہار ملتا ہے، کبھی
طنز کا اور کبھی گہرے جذبات کا ۔ اس کے
قصے کہانیوں اور ناولوں میں اخلاق پہلو نبھی
نظر انداز نہیں کیا جاتا[1] ۔“

پروفسر مائل نے لکھا ہے کہ اردو اور ہندی زبانوں کی سیاسی اہمیت بھی ہے جس کا ملک کی آزادی سے گہرا تعلق ہے ۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ہندی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان بنا دیا جائے ۔ اس سلسلے میں پروفیسر مائل نے اپنے مقالے کے صفحہ ۱۲۳ کے فٹ نوٹ میں ایک دل چسپ بات لکھی ہے : فرماتے ہیں :

”اس وقت جب کہ زیر نظر صفحے کی پریس میں
طباعت ہو رہی ہے ، ہندوستان کی آزادی کے
قانون کا نفاذ ہوگیا ہے ۔ یہ قانون ۱۵/اگست
۱۹۴۷ء سے نافذ ہوا جس کے لحاظ سے
ہندوستان کی مملکت کو دو حصوں میں تقسیم
کر دیا گیا ہے ۔ انڈین یونین اور پاکستان ۔
ہندی زبان کو (جسے ناگری رسم الخط میں
لکھا جاتا ہے) یونین کی سرکاری زبان قرار
دے دیا گیا ہے ۔ اسی کے ساتھ فرانس نے ایک

---

(۱) ۔ مقالہ صفحہ ۱۲۴ ۔

سفارت خانہ نئی دہلی میں اور ایک کراچی میں
قائم کر دیا ہے ۔ ایسی صورت میں غالباً ایک
دن یہ امر ناگزیر ہوگا کہ ان سفارت خانوں کے
عہدہ دار ہندی یا اردو سے واقف ہوں ۔"

پروفیسر مائل کی خوش فہمی قابل داد ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ غالباً وہ دن شاید ہی کبھی آئے جب فرانس اور دیگر ممالک کے سفرا اور اعلی عہدہ دار ہندوستان اور پاکستان میں کام کرنے کے لیے ہندی یا اردو سیکھنے کی ضرورت محسوس کریں ۔ بلکہ ابھی تو وہ دن بھی بہت دور ہے جب خود ہندوستان اور پاکستان میں قومی زبانوں کو وہ مقام دیا جائے گا جس کی وہ مستحق ہیں ۔ ع

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ایک لمحۂ فکریہ :

اردو زبان سے متعلق فرانسیسیوں کی تحریروں کے جو اقتباسات مقالۂ ھٰذا میں پیش کیے گئے ہیں وہ پاکستان اور ہندوستان کی تقریباً ڈھائی سو سال اُدھر کی تاریخ تمدن پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس تحقیق سے میرا فوری مقصد تو یہ تھا کہ ببلیوتک ناسیونال کے مشرقی شعبے پر اردو زبان کا مقام اور اہمیت خود فرانسیسی اہل علم کی تحریروں کے ذریعے واضح کروں ۔ یہ مقصد تو کافی حد تک حاصل ہوگیا

اور کتب خانے کے مشرق شعبے کے عہدہ داروں نے اپنی حقیقت بینی اور علم دوستی کا عملی ثبوت یہ دیا کہ اس موضوع کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کرکے اردو زبان کو اپنے کتب خانے میں ایک علیحدہ اور ممیز حیثیت دی ، اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی (جس کی ایک قومی زبان اردو قرار دی گئی ہے) ایک علیحدہ علمی موضوع قرار دے دیا ۔ لیکن یہ تحریریں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہتی ہیں ۔ میں اس سلسلے میں قارئین کی توجہ چند باتوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آج سے ڈھائی سو سال پہلے مشرقی علوم کے مطالعے کی بہت اہمیت تھی ۔ فرانس کے مورخین نے ہندوستانی اردو زبان کو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی اہم ترین زبان قرار دیا ۔ اس زمانے میں مغرب کو اس زبان سے آشنا کرنے کے لیے ضخیم لغتیں لکھی گئیں ۔ اس کے بعد اس زبان کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آج سے سوا سو سال پہلے اردو زبان کی تعلیم کے لیے پیرس کے مشرقی زبانوں کے مدرسے میں اردو زبان کے لیے پروفیسر کا عہدہ قائم کیا گیا ۔ اخباروں میں اردو زبان کی اہمیت پر اداریے لکھے گئے[1] ۔ اس کے بعد گزشتہ جنگ عظیم کے

---

(۱) ۔ یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب ابھی اردو زبان کا
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سفارت خانہ نئی دہلی میں اور ایک کراچی میں
قائم کر دیا ہے ۔ ایسی صورت میں غالباً ایک
دن یہ امر ناگزیر ہوگا کہ ان سفارت خانوں کے
عہدہ دار ہندی یا اردو سے واقف ہوں ۔"

پروفیسر مائل کی خوش فہمی قابل داد ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ غالباً وہ دن شاید ہی کبھی آئے جب فرانس اور دیگر ممالک کے سفرا اور اعلیٰ عہدہ‌دار ہندوستان اور پاکستان میں کام کرنے کے لیے ہندی یا اردو سیکھنے کی ضرورت محسوس کریں ۔ بلکہ ابھی تو وہ دن بھی بہت دور ہے جب خود ہندوستان اور پاکستان میں قومی زبانوں کو وہ مقام دیا جائے گا جس کی وہ مستحق ہیں ۔ ع

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ایک لمحۂ فکریہ :

اردو زبان سے متعلق فرانسیسیوں کی تحریروں کے جو اقتباسات مقالۂ ھٰذا میں پیش کیے گئے ہیں وہ پاکستان اور ہندوستان کی تقریباً ڈھائی سو سال اُدھر کی تاریخ تمدن پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس تحقیق سے میرا فوری مقصد تو یہ تھا کہ ببلیوتک ناسیونال کے مشرقی شعبے پر اردو زبان کا مقام اور اہمیت خود فرانسیسی اہل علم کی تحریروں کے ذریعے واضح کروں ۔ یہ مقصد تو کافی حد تک حاصل ہوگیا

اور کتب خانے کے مشرقی شعبے کے عہدہ داروں نے اپنی حقیقت بینی اور علم دوستی کا عملی ثبوت یہ دیا کہ اس موضوع کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کرکے اردو زبان کو اپنے کتب خانے میں ایک علیحدہ اور ممیز حیثیت دی ، اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی (جس کی ایک قومی زبان اردو قرار دی گئی ہے) ایک علیحدہ علمی موضوع قرار دے دیا ۔ لیکن یہ تحریریں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہتی ہیں ۔ میں اس سلسلے میں قارئین کی توجہ چند باتوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آج سے ڈھائی سو سال پہلے مشرقی علوم کے مطالعے کی بہت اہمیت تھی ۔ فرانس کے مورخین نے ہندوستانی اردو زبان کو فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی اہم ترین زبان قرار دیا ۔ اس زمانے میں مغرب کو اس زبان سے آشنا کرنے کے لیے ضخیم لغتیں لکھی گئیں ۔ اس کے بعد اس زبان کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آج سے سوا سو سال پہلے اردو زبان کی تعلیم کے لیے پیرس کے مشرقی زبانوں کے مدرسے میں اردو زبان کے لیے پروفیسر کا عہدہ قائم کیا گیا ۔ اخباروں میں اردو زبان کی اہمیت پر اداریے لکھے گئے[1] ۔ اس کے بعد گزشتہ جنگ عظیم کے

---

(۱) ۔ یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب ابھی اردو زبان کا
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ختم ہونے تک ہماری بے اعتنائی کے باوجود فرانسیسی مستشرقین نے اردو زبان کا ذکر اپنے مقالات میں کیا ۔

لیکن میں نے دیکھا کہ اب فرانس کی سب سے بڑی لائبریری میں اردو زبان کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا ۔

دوسری بات یہ کہ ۱۸۳۰ع میں اردو زبان کے لیے پروفیسر کا عہدہ قائم ہوا جس پر گارسیں دتاسی تا حیات گزشتہ صدی کے اواخر تک فائز رہے ۔ اس کے بعد جو عہدہ اردو زبان کے لیے قائم کیا گیا تھا ، وہ دوسری ہندوستانی زبانوں کے اساتذہ کو دے دیا گیا ۔ اردو زبان پڑھانے کے لیے اب صرف لیکچرار کا عہدہ کافی سمجھا گیا ہے (جس پر پہلے رحمت علی صاحب اور اب آلدرے گمبرتیر کام کر رہے ہیں) ۔ اگر ہماری بے اعتنائی کا یہی عالم رہا تو غالباً آئندہ اس کی ضرورت بھی باقی نہ رہے ۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ یورپ یا فرانس کو اب مشرقی زبانوں سے دلچسپی نہیں رہی ۔ اگر ایسا ہوتا تو آج پیرس میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اساتذہ نہ ہوتے ۔

لیکن آج پیرس میں ہندوستانی زبانوں کے چار بڑے

(گزشتہ صفحے کا باقی حاشیہ)

ابتدائی دور تھا ۔ ولی ، میر ، سودا کا کلام موجود تھا لیکن غالب ، انیس ، سید احمد ، اقبال ، جوش ، فیض اور حفیظ کا ادب تخلیق نہیں ہوا تھا ۔

پروفیسر اور ماہرین موجود ہیں ۔ سوربون کے پروفیسر رینو سنسکرت اور ہندی جانتے ہیں ، اردو نہیں جانتے ۔ کالژد فرانس کے پروفیسر فلیوزا تبتی اور ہندی زبانیں جانتے ہیں ، اردو نہیں جانتے ۔ زندہ مشرقی زبانوں کے مدرسے کے پروفیسر مائل (گارسیں دتاسی کے جانشین) تامل ، تلگو اور بنگالی کے ماہر تھے ، اردو نہیں جانتے تھے ۔ بلیونک زاسونال کے ماہر ہندوستانیات (جن سے پاکستان کی زبانوں کے بارے میں بھی رائے لی جاتی ہے) سنسکرت اور ہندی سے واقف ہیں ، اردو سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۔

آخر اس رجعت قہقری کی وجہ کیا ہے؟

غالباً یہ اب ہماری قومی خصوصیت بن چکی ہے کہ ہم اپنی کاہلی کے نتائج کا الزام ہمیشہ دوسرے پر رکھتے ہیں ۔ مثلاً فرانس (یا دیگر مغربی ممالک میں) اردو زبان سے دلچسپی میں کمی کا الزام نہایت اطمینان کے ساتھ ہم اپنے بیرونی سفارت خانوں پر رکھ دیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کو اپنے تمدن اور زبان سے واقف کرانا ہمارے سفارت خانوں کا کام ہے ۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ سفارت خانے ملک کا شوکیس ہوتے ہیں ۔ ان میں وہی چیز رکھی جاتی ہے جو ملک میں تیار ہوتی ہو اور جس کی ملک میں قدر کی جاتی ہو ۔ اردو زبان کی ملک میں کیا قدر ہو رہی ہے ، اس سے ہم خوب واقف ہیں ۔ ایسی

صورت میں پھر سفارت خانے کیا کریں ؟

حکومت فرانس ہر سال کئی طالب علموں کو فرانس کی یونیورسٹیوں میں ریسرچ کرنے کے لیے اسکالرشپ دیتی ہے ۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے پاکستانی طلبہ پیرس میں ایسے موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھتے ہیں جن کے لیے نہ تو مواد فرانس میں موجود ہے اور نہ اُن مضامین کے ماہرین فرانس میں ہیں ۔ یہ طلبہ تین چار سال پیرس میں قیام کرنے کے بعد ایک مقالہ لکھ دیتے ہیں اور انھیں ڈاکٹوریٹ مل جاتی ہے ۔ لیکن غالباً تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا ۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ ان پاکستانی طلبہ کی حوصلہ شکنی کی جائے ؛ میری رائے میں یہ مناسب ہوگا کہ فرانس جانے سے پہلے یہ طلبہ ہمارے ماہرین تعلیم اور دیگر اہل‌علم سے مشورہ کریں اور ان کے مشورے سے اپنی تحقیق کے موضوع کا انتخاب کریں ، اور جہاں تک ممکن ہو ایسے موضوع کا انتخاب کریں جس کا مواد فرانس میں موجود ہو ۔ اس کے ماہرین فرانس میں ہوں اور اس تحقیق سے ملک اور قوم کے علمی سرمائے میں قرار واقعی اضافہ ہو ۔ لیکن میں اس سلسلے میں پھر اس بات پر اصرار کرنے کی جسارت کروں گا کہ طلبہ کی حوصلہ شکنی نہ ہونی چاہیے ۔ انھیں تحقیق کے سلسلے میں جو رائے بھی دی جائے جلد دی جائے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دفتریت یا

کسی اور حھمیلے میں پڑ کر وہ اپنے اسکالر سب ہی سے محروم ہو جائیں۔

فرانس میں ریسرچ کرنے کے لیے ملکی اور قومی اہمیت کے بہت سے موضوع ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں :

۱ ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فرانسیسی سیاح اور مورخین :

فرانس کے کئی سیاحوں کے مخطوطات اور مطبوعہ کتابیں فرانس میں موجود ہیں ۔ ان میں سے بعض سال ہا سال تک ہندوستان میں رہے اور اس زمانے کے تاریخی واقعات پر لکھا۔ ہندوستان کے اس دور کی تاریخ جو ہمارے سامنے ہے ، وہ زیادہ تر انگریزوں کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھی ۔ فرانسیسی مورخین کی تحریروں سے اس زمانے کی تاریخ پر ایک دوسرے زاویے سے روشنی پڑتی ہے ۔ ان مورخین میں انکتل دوپروں کی شخصیت خود ایک علیحدہ تحقیق کا موضوع بن سکتی ہے ۔

۲ ۔ سترھویں صدی کی اردو ۔ لاطینی ۔ ھندی فرانسیسی لغت :

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے ، اس کے مسودے کی نقل ببلیوتک ناسیونال میں موجود ہے ۔ اگر اسے ایڈٹ

کر دیا جائے تو اردو زبان میں لغت نویسی میں ایک اہم اضافہ ہوسکتا ہے۔

۴۔ عہد مغلیہ کی تاریخ پر ببلیوتک ناسیونال میں فارسی مخطوطات :

انکتل دوپروں نے اپنی تحقیق کے سلسلے میں ہندوستان میں عہد مغلیہ کی تاریخ پر بارہ اہم مخطوطات کا ذکر کیا ہے جو ژانتیل (M. Gentil) اپنے ساتھ فرانس لائے اور انھیں ببلیوتک ناسیونال پیرس میں داخل کر دیا۔ دوپروں نے اپنے ہم وطنوں سے استدعا کی تھی کہ ان فارسی مخطوطات کا غور سے مطالعہ کیا جائے اور ان پر مزید تحقیق کی جائے[۱]۔ میں نے یہ مخطوطات ببلیوتک ناسیونال میں دیکھے۔ یہ نسخے نہایت صاف تحریر میں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی مخطوطات فارسی زبان میں ببلیوتک ناسیونال پیرس میں موجود ہیں، جو ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

---

(۱) دیکھیے Recherches Histoirique et Geographique Sur L' Inde" PremierePartie - صفحہ ۲۵۹ ببلیوتک ناسیونل پیرس۔ کیٹلاگ نمبر (OK² 271)۔

۴ ۔ ببلیوتک ناسیونال پیرس میں ہندوستانی شاعروں کے فارسی مخطوطات :

اس کتب خانے میں فارسی زبان کے ایک ہزار سے زیادہ مخطوطات موجود ہیں ۔ ہندوستانی شعرا کے مخطوطات میں حسب ذیل شامل ہیں :

دیوان حزیں ، دیوان امید ، مجموعۂ کلام مرزا محمد رضا قزل باش خاں ، مثنوی زہ ور آور سنگھ ، حملۂ حیدری ؛ دیوان مخفی ، مجموعۂ کلام شاہ محمد شاہ اور دیوان آفتاب (شاہ عالم ثانی) وغیرہ وغیرہ ۔

ہماری کوتاہ بینی اور تن آسانی کے باوجود ابھی تک فرانس اور بعض دیگر مغربی ممالک میں اردو زبان سے کچھ دلچسپی باقی ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کم از کم اس دلچسپی کو باقی رکھنے کی سعی کی جائے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کے ممالک اردو زبان کو زندہ زبانوں کی فہرست سے خارج کر دیں ۔ اور اگر ایسا ہوا تو خاکم بہ دہن کہیں ایسا نہ ہو علمی اور تہذیبی دنیا میں اس قوم کا وجود معرض خطر میں پڑ جائے جو اردو کو اپنی 'قومی

زبان، کہتی ہے[۱] -

---

(۱) - اس مقالے میں جن امور کا ذکر کیا گیا ہے ، ان کے بارے میں اگر کوئی صاحب مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں تو مجھ سے سینٹرل پبلک سروس کمیشن کراچی (پاکستان) کے پتے پر خط و کتابت کر سکتے ہیں -

---

یورپ میں اردو

اکتوبر ۱۹۶۲ع میں میں فرانس کی سول سروس کا مطالعہ کرنے کے لیے پیرس گیا اور یورپ کے مختلف ممالک میں قیام کے بعد ۱۹۶۴ع میں پاکستان واپس آیا - سرکاری فرائض کے علاوہ مجھے اپنی قومی زبان سے بھی دل چسپی ہے اور جب یورپ جاتا ہوں تو جہاں جہاں بھی مجھے اپنے ملک کے کلچر کے بارے میں کچھ معلومات ملتے ہیں ، میں استفادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں - اس مرتبہ یورپ میں قیام کے دوران میں میں نے وہ ادارے دیکھے جہاں اردو کی تعلیم باقاعدہ طور پر جاری ہے - اس موضوع پر میں نے مواد اکٹھا کر لیا ہے جو الگ کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا - اس موقع پر میں نہایت مختصر طور پر یورپ میں اردو زبان کے بارے میں چند باتیں عرض کروں گا -

پیرس :

سب سے پہلے میں نے پیرس میں اردو زبان کے بارے میں معلومات حاصل کیں - پیرس میں ایکول ناسیونال دے

لانگزو غیانتال ویوانت (مشرق زندہ زبانوں کا قومی مدرسہ) کوئی دو سو سال سے قائم ہے ۔ اس مدرسے میں یونانی ، عبرانی ، عربی ، فارسی ، چینی ، جاپانی ، سنسکرت ، ہندی ، اردو ، تلنگی ، کنڑی ، گجراتی ، بنگالی سب ہی مشرقی زبانوں کی تعلیم ہوتی ہے ۔ اردو زبان کے مشہور محسن گارسیں دتاسی نے اپنی عمر اسی ادارے میں صرف کی ۔ گارسیں دتاسی پر ایک تحقیقی مقالہ حال ہی میں ہندوستان کی سیدہ ثریا حسین نے سوربون میں پیش کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کیا ہے ۔ اس مقالے میں مصنفہ نے گارسیں دتاسی کی ۱۵۵ تصانیف گنوائی ہیں ۔ غالباً ہندوستان اور پاکستان کے شاید ہی کسی محقق نے اتنا کام اردو زبان پر کیا ہو ۔ افسوس ہے کہ ابھی ہم گارسیں دتاسی کے کام کے بیشتر حصے سے ناواقف ہیں ۔ گارسیں دتاسی کے خطبات کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے اور اس کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر حمید اللہ کی نظرثانی کے بعد دوبارہ شائع ہوا ہے ۔ لیکن اس کی بقیہ تصانیف کو اردو داں طبقے سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے ، گارسیں دتاسی نے اپنی 'تاریخ ادب اردو' ، 'دیوان ولی' اور چند دیگر مضامین میں قدیم اردو شعرا ولی ، میر ، سودا وغیرہ کے کلام کا نہایت خوب صورت فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے ۔

گارسیں دتاسی کے علاوہ فرانس کے دیگر اہل علم

سیاحوں اور مورخوں نے بھی اردو کے بارے میں لکھا ہے۔
۱۸۲۸ء میں مشرقی زبانوں کے مدرسہ یا ادارے میں اردو زبان کی پروفیسری قائم ہوئی تو پیرس کے مشہور اخبار لاؤنیٹی یونیورسل نے اداریہ لکھا۔ ان تحریروں کا مختصر تذکرہ آپ اس سے پہلے مضمون "اردو کی بابت فرانسیسیوں کی تحریریں" میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

مشرق زبانوں کے ادارے میں اردو زبان کا کورس تین سال کا ہے۔ ہر سال امتحان لیا جاتا ہے۔ اردو زبان ایک فرانسیسی موسیو آندرے گمبرتیر پڑھاتے ہیں۔ ان کی مدد حیدر آباد دکن کے ایک نوجوان عبدالماجد صاحب کرتے ہیں۔ اردو کے ڈپلوما کا معیار تقریباً ہمارے میٹریکولیشن کے مساوی ہے۔

اردو زبان کے مخطوطات کا ایک قیمتی ذخیرہ پیرس کی مشہور لائبریری ببلیوتک ناسیونال میں موجود ہے۔

پیرس کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں عرض کر دوں کہ جن "غلط فہمیوں" کا ذکر میں نے گزشتہ مضمون میں کیا ہے، ان کی ذمہ داری اہل فرانس سے کہیں زیادہ ہم پر ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ پیرس کے علمی حلقوں میں اردو کی جتنی قدر آج سے ڈیڑھ سو سال قبل تھی، وہ اب نہیں رہی۔ اردو زبان کے لیے جو پروفیسری قائم ہوئی تھی اس پر اب

کوئی اردو پڑھانے والا مامور نہیں ہے ۔ (آندرے گمبرتیر لیکچرار ہیں) اس کے برخلاف سنسکرت کے پروفیسر ہیں ۔ حتیٰ کہ تلگو ، تبتی ، ہندی ، گجراتی ، کنڑی آڑیا زبانوں کے لیے پروفیسر ہیں لیکن اردو کے لیے پروفیسر نہیں ہے ۔ اس کے لیے ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ہمارے ملک کے لوگ جو فرانس جاتے ہیں ، ان میں سے چند قابل عزت شخصیتوں کے علاوہ کتنے حضرات نے اپنے ملک کے کلچر اور زبان سے تعلق رکھنے والے اداروں سے ربط قائم کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور وہاں کیا کیا کام کیا ؟ جب ہم خود اپنے ملک کے کلچر اور زبان کے لیے کام کرنے میں تن آسانی کا ثبوت دے رہے ہیں تو فرانسیسیوں سے کیا شکوہ ہو سکتا ہے ۔

لندن ، آکسفرڈ ، کیمبرج :

لندن میں صورت حال نسبتاً بہتر ہے ۔ انگریزوں نے اردو زبان کے لیے جو کام کیا اس سے ہم کافی حد تک واقف ہیں ۔ لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو عرصۂ دراز سے نصاب میں شامل ہے ۔ ہز ایکزالٹیڈ ہائی نس دی نظامس ریڈر ان اردو لٹریچر کے عہدہ کے لیے میرے لندن میں قیام کے دوران میں اشتہار دیا گیا تھا ۔ اردو زبان کے لیکچرار کے دو عہدے ہیں ،

ایک عہدے پر انگریز کا تقرر کیا جاتا ہے اور دوسرے پر اہل زبان (پاکستانی یا ہندوستانی) تین سال کے لیے مقرر کیا جاتا ہے ۔ اس وقت ان عہدوں پر رالف رسل[1] صاحب اور ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کام کررہے ہیں[2] ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب سے اردو داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے اس لیے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ۔ رالف رسل صاحب کو اردو زبان اور ادب سے جتنی محبت ہے وہ میں نے اپنے ہم وطنوں میں بھی بہت کم دیکھی ہے ۔ رسل صاحب لندن اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے گریجویٹ ہیں ۔ اردو بہت روانی سے بولتے ہیں ۔ ادبیات پر بڑی اچھی نظر ہے ۔ اس وقت غالب کے خطوط کا ترجمہ کر رہے ہیں ۔ یہ کام انھیں ہندوستان کی طرف سے یونسکو کی معرفت ملا ہے ۔ دروغ برگردن راوی ، میں نے لندن میں سنا (رسل صاحب کی زبانی نہیں) کہ پاکستان سے خطوں کے جواب مشکل ہی سے آتے ہیں ۔

اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں اردو زبان اور ادب کی تعلیم بی ۔ اے آنرز کے معیار تک ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ تحقیق کے لیے بھی مواقع ہیں ۔ اور مقالہ

---

(۱) ۔ رسل صاحب اب ریڈر ہوگئے ہیں ۔
(۲) ۔کتاب زیر طبع تھی کہ ڈاکٹر صاحب واپس پاکستان آگئے۔

کامیابی سے ختم کرنے پر ڈاکٹریٹ دی جاتی ہے۔ اس ادارے کا اپنا کتب خانہ ہے۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں بھی اردو زبان کی کتابوں اور مخطوطات کا بیش قیمت ذخیرہ موجود ہے۔

آکسفرڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں اردو داخل نہیں لیکن اس کی کوشش ضرور کی جارہی ہے۔ چناں چہ کیمبرج یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے پروفیسر اور مشہور مستشرق جناب آر بری صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ اردو سے محبت رکھتے ہیں لیکن ابھی تک اردو زبان کو نصاب میں داخل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانے میں اردو کے اچھے مخطوطات موجود ہیں۔ خصوصاً مثنوی 'سحرالبیان' کے دو نہایت دیدہ زیب مصور نسخے موجود ہیں۔ ایسے ہی آکسفرڈ کی باڈلین لائبریری میں اردو زبان کے مخطوطات موجود ہیں۔

برسلز :

برسلز میں ایک ادارہ 'سانتر دورائے تود دے پرابلیم دو ماند موزلماں کانتامپورین' یعنی 'موجودہ اسلامی دنیا کے مسائل کے مطالعے کا مرکز' قائم ہے۔ اس ادارے میں

ایک شعبہ 'ساژ دے زنے نود دو لانگرہ شتانال' ہے
جس میں اردو کی تعلیم اکتوبر ، ۱۹۶۲ء سے شروع کی
گئی ہے ۔ اس ادارے میں اردو زبان کے سرٹیفکیٹ کا کورس
تین سال کا رکھا گیا ہے ۔ میں نے اردو کے استاد مسٹر
سین سے ملاقات کی ۔ یہ مغربی پنجاب کے رہنے والے ہیں
اور اب ہندوستانی ہیں ۔ یہ اردو زبان کی دو کلاسیں اول
اور دوئم پڑھاتے ہیں ۔ اردو کی تعلیم اپنے ابتدائی مراحل
میں ہے اور میں نے برسلز میں پاکستان کے سفارت خانے
کے جواں سال سیکنڈ سیکرٹری ولی اللہ صاحب سے کہا ہے
کہ وہ اردو زبان کی تعلیم میں اس ادارے کی ہر ممکنہ
مدد کریں ۔

روم :

روم یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ۔
(ہندی کے لیے انتظام ہے) اردو زبان کی تعلیم کا انتظام
ایک غیرسرکاری ادارے میں جسے مختصراً "ازمیو" (Ismeo)
کہتے ہیں اور جس کا پورا نام 'انستی تو تو اتالیا نو پرال
میدیو اے ایستریمو اوریانت' ہے ، یعنی 'مشرق وسطیٰ
اور بعید کے لیے اطالوی ادارہ' ۔ اس کا مرکز روم میں
ہے اور شاخیں میلان اور تیورن میں جہاں اردو نصاب
میں داخل ہے ۔ اس ادارے کے صدر مشہور ماہر

آثار قدیمہ اور مستشرق پروفیسر توچی ہیں ۔ میں نے روم میں یہ ادارہ دیکھا ۔ اس کے ساتھ ایک آثار خانہ بھی ہے اور کتب خانہ بھی ہے ۔ اردو زبان ایک نوجوان ضیا احمد صاحب پڑھاتے ہیں ۔ یہ نوجوان دراصل معاشات کے ماہر ہیں اور ان کا ذریعہ معاش معاشیات پر تحقیق ہی ہے ۔ اردو زبان کی تعلیم جز وقتی طور پر دیتے ہیں ۔ اردو کلاسیں شام کے وقت ہوتی ہیں ۔

'ازمیو' کے سلسلے میں میں اردو زبان کے ایک نوجوان اطالوی سکالر ڈاکٹر ویتو سالیرنو کا ذکر کردوں جو کئی سال تک پاکستان میں رہے اور اب میلان میں ہیں ۔ اردو تدریس کانفرنس میں بھی انھوں نے ایک مضمون "اردو میری نظر میں" پڑھا تھا ۔ موصوف نے اردو شعرا کے کلام کا مختصر انتخاب اور اس کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے ۔ اس کے علاوہ انھوں نے پروفیسر احمد علی کی ایک کہانی 'موت سے پہلے' کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ہے ۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مضامین سالیرنو صاحب نے اردو زبان کے بارے میں لکھے ہیں ۔

نیپلز :

نیپلز میں مشرق علوم کا مشہور و معروف ادارہ

"انستی ٹوتو اونیورستاریو اوریئنتالے" یعنی نیپلز یونیورسٹی کا مشرق ادارہ ہے ۔ اس ادارے میں مشرقی علوم اور زبان و ادب کی تعلیم کا معقول انتظام ہے ۔ مشہور اطالوی مستشرق اور اردو زبان کے پروفیسر باوسانی اسی ادارے سے متعلق ہیں ۔ پروفیسر باوسانی نے کئی کتابیں لکھی ہیں ۔ اقبال کے کلام کا ترجمہ کیا ہے ۔ ایک کتاب پاکستانی ادب پر بھی لکھی ہے ۔ پروفیسر باوسانی اکثر پاکستان آتے رہتے ہیں ۔ اس ادارے میں اب ڈاکٹر اقندا حسن صاحب اردو کے پروفیسر ہیں ۔ اٹلی میں صرف یہی ایک ادارہ ہے جہاں سے اردو میں ڈاکٹریٹ کی جا سکتی ہے ۔ کتب خانے میں اردو کی کتابوں کا مختصر سا ذخیرہ ہے جس میں اب توسیع کی جا رہی ہے ۔

جیسا کہ میں نے مضمون کے شروع میں عرض کیا ، میں نے اردو کی تعلیم کے اداروں کے بارے میں چند باتیں یہاں بیان کی ہیں ؛ ان اداروں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے اردو زبان سے کتنی بےاعتنائی برتی ہے ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام بلکہ بر صغیر کی تقسیم کے وقت تک ہندوستان کی زبان "ہندوستانی" ہی سمجھی جاتی تھی (یعنی فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی زبان اردو) ۔ ہندی کا کوئی قابل لحاظ مقام نہیں تھا ۔ لیکن اس سترہ سال کے عرصے میں ہندی زبان نے بڑی جلدی

مقبولیت حاصل کی ہے۔ یورپ کے نئی ملکوں میں ہندی زبان کے اساتذہ اور طالب علموں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ بعض ملکوں میں اردو کا نام و نشان اب باقی نہیں رہا۔ (مثلاً سویڈن میں جہاں پہلے اردو نصاب میں شامل تھی) اس کے وجوہات ظاہر ہیں۔ ہم نے ان ملکوں کے اداروں میں کوئی دل چسپی نہیں لی بلکہ خود اپنے ملک میں اردو کو کوئی قابل عزت مقام نہیں دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اداروں سے ربط قائم کیا جائے۔

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی اور اردو تذکرے

دتاسی کی "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی"[1] اردو زبان کے اہم تذکروں میں سے ہے۔ یہ اردو زبان پر سب سے زیادہ ضخیم اور بسیط تذکرہ ہے۔ تین جلدوں کے اس تذکرے میں اردو اور ہندی شعرا اور اہل قلم کے حالات کے علاوہ منتخب کلام کا نہایت سستہ فرانسیسی زبان میں ترجمہ شامل ہے۔ زیر نظر سطور میں ان اردو تذکروں کا ذکر کیا جائے گا جن سے دتاسی نے اس تذکرے کی تالیف میں استفادہ کیا یا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے؛ پہلا ایڈیشن پیرس سے ۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۷ء دو جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد میں ۶۳۶ صفحات اور دوسری جلد میں ۶۴۰ صفحات تھے۔ دوسرا ایڈیشن پیرس سے ۷۱ - ۱۸۷۰ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا جن میں علی الترتیب ۶۲۴+۴=۶۲۸ ، ۶۰۸ اور ۶۰۲+۱۰=۶۱۱ صفحات

(۱) ". . . la littérature Hindouie et Hindoustanie"

ہیں ۔ یہ ایڈیشن کل ۱۸۴۷ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اور اس مضمون کی تیاری میں یہی ایڈیشن میرے پیش نظر رہا۔ اس ایڈیشن کا نسخہ میں نے پنجاب پبلک لائبریری سے حاصل کیا ۔ اس ایڈیشن کی جلد اول میں پہلے چار صفحات کا مختصر دیباچہ ہے جس میں نئے ایڈیشن کی تالیف و اشاعت کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں ۔ اس کے بعد اکہتر (۷۱) صفحات کا مقدمہ ہے جس میں ہندوستانی زبان کی ابتدا اور ارتقا پر اظہار خیال کیا گیا ہے ۔ مقدمے میں اُن اردو تذکروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے مؤلف نے استفادہ کیا ۔ اردو اور ہندی کی اصناف سخن وغیرہ کو بھی خاصی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد اردو اور ہندی کے شعرا اور دیگر اہل قلم کے حالات زندگی بہ اعتبار حروف تہجی بیان کیے گئے ہیں اور ان کے کلام سے اقتباسات لے کر ان کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا گیا ہے ۔ (اصل اردو یا ہندی متن پیش نہیں کیا گیا) دوسری جلد میں بھی شعرا کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام کا فرانسیسی ترجمہ ہے ۔ تیسری جلد میں پہلے آٹھ صفحات کے پیش لفظ میں دتاسی نے لکھا ہے کہ اسی اثنا میں اسے ایک نہایت کارآمد تذکرہ موسومہ "نسخۂ دل کشا" کے دوسرے حصے کا مخطوطہ مل گیا جس میں اُن شعرا کے حالات ہیں جن کے نام "ک" اور اس کے بعد کے

حروف تہجی سے شروع ہوتے ہیں ۔ (اس تذکرے کا بیان میں آگے چل کر کروں گا) اس کے بعد دتاسی نے ان شعرا اور شاعرات کے نام دیے ہیں جن کا ذکر "نسخۂ دل کشا" میں کیا گیا ہے۔ بس لفظ کے آخر میں دتاسی نے نہال چند لاہوری[1] کی کتاب "باغ و بہار" عرف "فسانۂ سحر" میں سے بعض اشعار کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا ہے ۔ اس کے بعد صفحہ ۳۵۳ تک دیگر جلدوں کی طرح شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام کا فرانسیسی ترجمہ ہے ۔ اور پھر صفحہ ۳۵۴ سے صفحہ ۳۷۶ تک "نسخۂ دل کشا" کے حصۂ اول کا ترجمہ دیا گیا ہے ، جس میں ان شعرا کے حالات ہیں جن کے نام "ک" اور اس سے پہلے کے حروف تہجی سے شروع ہوتے ہیں ۔ ان شعرا کی فہرست بھی دی گئی ہے ۔ ۳۷۷ سے ۳۸۸ صفحات تک ایک طویل ضمیمہ ہے جس میں گارسیں دتاسی نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اس کے زیر مطالعہ رہیں اور جن کا ذکر ان تین جلدوں میں کہیں نہیں آیا ۔ کتابوں کی اس طویل فہرست کو دتاسی نے حسب ذیل

---

(۱) اس مصنف کا ذکر کرتے ہوئے دتاسی نے لکھا ہے کہ : "انھوں نے قصہ 'چہار درویش' نظم کیا ہے اور سب کا نام (اس کی اصل تصنیف) "باغ و بہار" ہی رکھا ہے ۔ یہ کتاب نول کشور سے ۱۲۷۳ ہجری مطابق ۵۷-۱۸۵۶ع میں شایع ہوئی ۔

موضوعات میں تقسیم کیا ہے :

مذہب ، فلسفہ ، فقہ ، سائنس ، آرٹ ، تاریخ ، جغرافیہ ، انشاء و ادب اور متفرق -

۴۸۹ سے ۶۰۳ صفحات تک مصنفین کے ناموں کا اشاریہ ہے - اسی پر کتاب ختم ہوتی ہے -

افسوس ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ ابھی تک شائع نہیں ہوا - کہا جاتا ہے کہ منشی کریم الدین کا تذکرہ "طبقات الشعرائے ہند" گارسیں دتاسی کی تاریخ کا ترجمہ یا آزاد ترجمہ ہے[1] - یہ بیان غلط فہمی پر مبنی ہے - "طبقات الشعرا" میں گارسیں دتاسی کی "تاریخ" سے کہیں کہیں استفادہ ضرور کیا گیا ہے لیکن یہ ترجمہ یا آزاد ترجمہ نہیں ہو سکتا - اول تو یہ کہ گارسیں دتاسی کی تاریخ ضخامت اور شعرائے مذکورہ کی تعداد کے لحاظ سے "طبقات الشعرا" سے کہیں زیادہ مبسوط ہے - دوسرے یہ کہ فرانسیسی متن کا اردو "ترجمے" سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو کہیں کہیں مناسبت تو مل جاتی ہے لیکن ترجمے کا تسلسل نہیں ملتا - تیسرے یہ کہ کتاب کے سرورق کی تحریر اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ غالباً اس کتاب

---

(۱) ڈاکٹر زور نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے - ملاحظہ ہو : 'گارسیں دتاسی' صفحہ ۱۹ -

کا مصنف فرانسیسی زبان سے تقریباً نا بلد تھا ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں "طبقات الشعرا" کا جو نسخہ موجود ہے اس کے سرورق پر یہ عبارت چھپی ہوئی ہے :

"A history of Urdu poets chiefly translated from Garcin de Tassy's histoire de la *literature* hindouie *at* hindustanie."

اس مختصر تحریر میں فرانسیسی الفاظ کی دو غلطیاں ہیں (غلط الفاظ ٹیڑھے حروف میں لکھے گئے ہیں ۔) پہلی یہ کہ لفظ لٹریچر انگریزی میں literature لکھا جاتا ہے اور فرانسیسی میں لٹرانیور (litterature) لکھا جاتا ہے ۔ یعنی انگریزی میں i کے بعد ایک ٹی(t) ہے اور فرانسیسی میں دو ٹی (tt) ہیں ۔ دوسرے یہ کہ ٹیڑھا لفظ ایٹ (at) نہیں بلکہ 'اے' (et) بہ معنی "اور" ہونا چاہیے ۔ ممکن ہے فیلو صاحب نے کہیں کہیں کریم الدین صاحب کو دتاسی کی تاریخ کی جلد اول کے فرانسیسی متن کا ترجمہ سنا دیا ہو یا لکھا دیا ہو لیکن "طبقات الشعرائے ہند" کو دتاسی کی "تاریخ" کا ترجمہ نہیں کہا جا سکتا ۔

گارسیں دتاسی کی تاریخ پر مفصل تبصرے کا یہ موقع نہیں ، اس موضوع پر پھر کبھی لکھوں گا ۔ زیر نظر مضمون کا موضوع صرف اردو تذکروں تک محدود ہے ۔ ان میں سے بعض تذکرے مشہور ہیں اور چھپ چکے ہیں ؛ بعض کا کچھ پتا نہیں چلتا ، اور بعض کے بارے میں دتاسی سے

سہو بھی ہوا ہے ۔ میں اس مضمون میں صرف دتاسی کا بیان پیش کرنے پر اکتفا کروں گا ۔ اس کی تنقیح تذکروں کے متخصصین کے لیے چھوڑتا ہوں ۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، دتاسی نے جلد اول کے مقدمے میں اُن تذکروں کا ذکر کیا ہے جن سے اس نے استفادہ کیا ہے یا جو اُس کے علم میں آئے لیکن وہ اُن تک دسترس حاصل نہ کر سکا ۔ میں نے سب سے پہلے مقدمے کے اس حصے کا ترجمہ کر دیا ہے ۔ پہلے ہر تذکرے کا نام دیا گیا ہے ، پھر مصنف کا نام اور اس کے بعد دتاسی کے مقدمے کے متعلقہ حصے کا ترجمہ واوین میں لکھ دیا گیا ہے ۔ اس کے بعد میں نے ان تذکروں کے بارے میں مزید معلومات درج کی ہیں جو مختلف شعرا کے ذکر میں گارسیں دتاسی نے اس کتاب میں بیان کی ہیں ۔ یہ معلومات ساری کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں اور انھیں جمع کرنے کے لیے میں نے تینوں جلدیں ایک بار پھر پڑھیں اور اب شاید ہی کوئی اہم بات ان تذکروں کے بارے میں ایسی ہوگی جو دتاسی نے کہی ہو اور میں نے اس کا ذکر ان سطور میں نہ کیا ہو ۔ اس مطالعے میں مجھے چند ایسے تذکروں کا بھی حوالہ ملا جن کا ذکر دتاسی نے اپنے مقدمے میں نہیں کیا ؛ ان کا ذکر میں نے آخری حصے میں کیا ہے ۔

۱ - "**عیارالشعرا** : مصنفہ خوب چند ذکا - یہ کتاب مصنف نے اپنے مربی میر ناصرالدین ناصر کی فرمائش پر لکھی جنھیں 'میر کلو' بھی کہا جاتا تھا - اس کا سن تالیف ۱۲۴۷ ہجری (مطابق ۱۸۳۱-۳۲ء) یا اس سے بہت پہلے ۱۲۰۸ ہجری (مطابق ۱۷۹۳-۹۴ء) ہوسکتا ہے کیوں کہ مصنف نے کہا ہے کہ انھوں نے اس کتاب پر تیرہ سال کام کیا - ذکا کا ۱۸۴۶ء میں انتقال ہوا - یہ تاریخ ڈاکٹر اسپرنگر کو خود ذکا کے پوتے سے معلوم ہوئی -

ذکا کا تذکرہ اُن تذکروں میں سے ہے جن سے میں نے بالواسطہ استفادہ کیا ہے - یہ فارسی میں ہے اور اس میں تقریباً پندرہ سو شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں - ڈاکٹر اسپرنگر نے جس نسخے کا ذکر کیا ہے، اس میں کوئی ایک ہزار صفحات ہیں اور ہر صفحے میں پندرہ سطور ہیں - فاضل مستشرق کی رائے میں اس تذکرے میں تبصرہ بہت کم کیا گیا ہے - یہ تکرار اور اغلاط سے پُر ہے - بہرحال یہ تذکرہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے - لیکن افسوس ہے کہ اس کا کوئی نسخہ یورپ میں نہیں ہے -"

جلد سوئم صفحہ ۳۵ پر دتاسی نے لالہ خوب چند

ذکا کا بیان کیا ہے اور اس تذکرے کے بارے میں وہی باتیں کہی ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ **"چمن بے نظیر یا مجمع الاشعار:** یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے دو ایڈیشنوں کے ہیں۔ یہ دونوں ایڈیشن ۱۲۶۵ ہجری (مطابق ۴۹-۱۸۴۸ء) اور ۱۲۶۶ ہجری (مطابق ۵۰-۱۸۴۹ء) میں بمبئی میں شائع ہوئے۔ پہلے کے مصنف محمد حسین ہیں اور دوسرے کے محمد ابراہیم۔ موخرالذکر غالباً وہی ہیں جنھوں نے 'انوار سہیلی' کا دکھنی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۲۴ء میں مدراس سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں ہندوستانی زبان کے ایک سو ستاسی (۱۸۷) شعرا کے کلام کے نمونے ہیں۔"

۳۔ **"مقبول نبی کی بیاض:** اس میں اردو کے تین سو شعرا کے ساتھ ہزار اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ نسخہ آگ کی نذر ہوگیا۔ اس لیے میں صرف حافظے ہی کی بناپر اس کا حوالہ دے سکتا ہوں۔"

۴۔ **"دیوان جہاں:** یہ اردو تذکرہ ایک ہندو کا لکھا ہوا ہے، اور یہ اُن تذکروں میں سے ہے جنھیں میں نے زیر نظر تاریخ کی تالیف میں پیش نظر رکھا ہے۔

دیوان جہاں، شعروں کی بیاض زیادہ ہے اور تذکرہ کم۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو لکھنے والوں کے

بہت مختصر حالات اور انتخاب کلام شامل ہے۔"

۵۔ "گلدستۂ حیدری: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ تذکرہ حیدر بخش حیدری کا ہے۔ اس میں کچھ لطیفوں اور ایک دیوان کے علاوہ ہندوستانی شعرا کا تذکرہ بھی ہے۔"

۶۔ "گلدستۂ نازنیناں: یہ تذکرہ میرے معاصر مولوی کریم الدین کا ہے اور بہت خوب ہے۔ اس میں ممتاز ہندوستانی شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔"

جلد دوئم صفحہ ۱۰۹ پر کریم الدین کے سلسلے میں دتاسی لکھتا ہے کہ:

"یہ تذکرہ ۱۲۶۱ ہجری (مطابق ۱۸۴۵ء) میں دہلی میں شائع ہوا۔ یہ ۵۰۳ صفحات کی کتاب ہے اور ہر صفحے پر ۲۰ سطریں ہیں۔ اس میں ۹۰۰ شعرا کے حالات درج ہیں۔"

۷۔ "گلدستۂ نشاط: (مختصر)۔ میں نے اس تذکرے کو زیر نظر تصنیف میں پیش نظر رکھا ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر فصاحت اور بلاغت پر لکھی گئی ہے۔ ہندوستانی اور ایرانی شاعری سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس میں ہندوستانی زبان کی بہت سی نظمیں اور اشعار شامل کیے گئے ہیں جنھیں موضوع کے اعتبار

سے تقسیم کیا گیا ہے۔"

جلد دوم صفحہ ۲۰۷ پر دتاسی نے اس تذکرے کے مصنف ذوالفقار علی بیگ مضطر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ میر حسین علی خان حیدر آبادی کے فرزند تھے۔

۸۔ "گلشن ھند: مصنفہ کریم الدین (جن کا میں نے گزشتہ سطور میں ذکر کیا ہے) اس کتاب میں اقوال زریں اور عاضرات درج ہیں جنہیں آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصے کو 'گلشن' کہا گیا ہے۔ آٹھویں حصے میں منتخب اشعار تحریر کیے گئے ہیں جو حفظ کرنے کے قابل ہیں۔"

۹۔ "گلشن مسرت: یہ شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے جو مصطفی خان دہلوی نے لکھا ہے۔ یہ مطبع مصطفائی کے مالک ہیں۔ اس مطبع سے ہندوستانی کی کئی کتابیں شایع ہوئیں۔"

جلد دوم صفحہ ۲۰۴ پر لکھا ہے کہ یہ بیاض ۱۸۵۰ء میں لکھنو سے شائع ہوئی۔

۱۰۔ "گلستان سخن: مصنفہ مبتلا (کاظم)۔ جلد دوم صفحہ ۳۴۴ پر دتاسی لکھتا ہے کہ:

"مرزا کاظم مبتلا نواب محمد علی خان کے فرزند تھے جنھیں اودھ میں میر مردان علی خان کا خطاب دیا

گیا تھا۔ ان کا تعلق سسہم کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ "گلشن سخن" کا ذکر شیفتہ نے کیا ہے۔"

۱۱۔ "گلستان سخن: اس تذکرے کا نام بھی وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اسے قلعۂ دہلی کے شہزادے قادر بخش صابر نے لکھا ہے۔"

مرزا قادر بخش مرزا محمد بخش کے بیٹے اور امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ یہ قلعۂ مبارک میں پلے بڑھے اور غدر ۱۸۵۷ع تک وہیں رہے۔ 'گلستان سخن' ۴۴۵ صفحات کا تذکرہ ہے۔ ہر صفحے میں ۱۲ سطریں ہیں۔ اس کا ایک نسخہ دہلی کے شاہی کتب خانے میں تھا جسے برطانیہ نے ۱۸۵۷ع میں خریدا۔ اس کا کیٹلاگ نمبر ۱۰۸۷ ہے۔ دتاسی نے فٹ نوٹ میں مزید یہ حوالہ بھی دیا ہے کہ اس تذکرے کے شائع ہونے کا اعلان "اخبار عالم" میرٹھ کے شمارہ ۲۴۔ اگست، ۱۸۶۷ع میں کیا گیا۔ (جلد سوئم صفحہ ۶)۔

۱۲۔ "گلشن بے خار: (محمد مصطفیٰ شیفتہ) میں نے اس کا ایک نسخہ اس وقت حاصل کیا جب یہ شائع بھی نہیں ہوا تھا۔ اس میں چھ سو (۶۰۰) ہندوستانی شعرا کے حالات اور منتخب کلام درج ہے۔ میں نے

زیر نظر تصنیف کے دوسرے ایڈیشن میں اس تذکرے
سے بہت استفادہ کیا ہے ۔"

دتاسی نے مزید لکھا ہے کہ :

"یہ تذکرہ ۱۲۴۸ ہجری تا ۱۲۵۰ ہجری (مطابق ۱۸۳۲ تا ۱۸۳۴ع) میں لکھا گیا ہے ۔ ۱۸۴۵ع میں مولوی محمد باقر کے مطبع سے شایع ہوا ۔"

۱۳ ۔ "گلشن بے خزاں : (غلام قطب الدین باطن) یہ 'گلشن بے خار' کا اردو ترجمہ ہے ۔"

۱۴ ۔ "گلشن ہند : (علی لطف دہلوی) اس تذکرے میں ساٹھ (۶۰) شعرا کے مفصل حالات درج ہیں ۔ میں نے اس سے اپنے کام میں بہت استفادہ کیا ۔"

جلد دوئم صفحہ ۲۳۶-۳۷ پر مرزا علی لطف کے مختصر حالات زندگی بیان کرنے کے بعد دتاسی نے اس تذکرے کا ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا پورا نام "تذکرۃ الشعرا مرزا علی لطف نظم و نثر" ہے ۔ یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ (مطابق ۱۸۰۰-۱ع) میں لکھا گیا ۔ مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ 'گلزار ابراہیم' سے ماخوذ ہے ۔ لیکن دراصل یہ کتاب 'گلزار ابراہیم' سے بالکل علیحدہ ہے ۔ اس میں ایسے شعرا کے حالات بھی بیان کیے

گئے ہیں جن کا تذکرہ "گلزار" میں نہیں ملتا - اس میں شعرا کے حالات زیادہ تفصیل سے دیے گئے ہیں - اس تذکرے کے حصۂ اول میں ممتاز شعرا کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام تفصیل سے لکھے گئے ہیں - دوسرا حصہ نسبتاً کم اہم شعرا کے لیے مختص تھا لیکن وہ حصہ مکمل نہ ہو سکا - چناں چہ نظام کے وزیر اعظم کے کتب خانے میں صرف حصہ اول کا نسخہ موجود ہے - اس کی نقل جنرل اسٹوارٹ نے کروا کر دتاسی کو بھیجی - یہ نسخہ سید ذوالفقار علی تجلی نے ۱۲۵۳ھ مطابق ۳۸-۱۸۳۷ء میں نقل کیا[1] -

۱۵ - "گلزار ابراھیم: مصنفہ علی ابراہیم - اس میں تین سو اردو شعرا کے حالات اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے - یہ تذکرہ اُن میں سے ہے جن سے مجھے اپنے کام میں بہت مدد ملی -"

جلد دوئم صفحہ ۲ پر دتاسی لکھتا ہے کہ :

---

۱ - یہ مخطوطہ اب ببلیوتیک ناسیونال پیرس میں ہے - اور اس کا کیٹلاگ نمبر ۸۵۷ ہے - اس کا ذکر میں نے اپنی زیر طبع کتاب "پیرس میں اردو مخطوطات" میں کیا ہے -

"مصنف نے یہ تذکرہ ۱۱۸۶ ہجری مطابق ۱۷۷۲ء
میں لکھنا شروع کیا اور ۱۱۹۸ ہجری مطابق ۱۷۸۳ء
میں ختم کیا۔"

۱۶ - "**گلزار مضامین** : مصنفہ جان طپش - یہ ممتاز شعرا کے
منتخب کلام کا مجموعہ بھی ہے اور تذکرہ بھی -
اس کے دیباچے میں مصنف نے اردو شاعری اور
شعرا کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے ۔"

میر محمد اسماعیل عرف مرزا جان طپش کے بیان میں
دتاسی نے 'گلزار مضامین' کا مختصراً ذکر کیا ہے :

"یہ کتاب ۱۱۹۹ھ مطابق ۸۵-۱۷۸۴ء میں شائع
ہوئی - اس کا جو نسخہ فورٹ ولیم کالج میں ہے
اس میں ۸۰۲ صفحات ہیں ۔" (جلد سوئم - صفحہ ۲۲۱)

۱۷ - **انتخاب دواوین یا خلاصہ دیوان ھا** : مصنفہ امام بخش
صہبائی دہلوی - یہ مشہور شعرا کے کلام کا
انتخاب ہے - یہ کتاب بیاض کی نوعیت کی ہے -
بعض شعرا کے کلام کا نمونہ پیش کرنے سے پہلے
ان کے مختصر حالات زندگی بھی دے دیے گئے ہیں -
اس طرح اسے تذکرہ بھی کہا جا سکتا ہے ۔"

امام بخش صہبائی کے بیان میں دتاسی نے اس تذکرے
کا نام 'انتخاب دواوین شعرائے مشہور زبان اردو کا'
(کذا) لکھا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ولی ، درد ،

سودا ، میر ، جرأت ، حسن ، ناصر ، ممنون ، ناسخ ، مول چند، ذوق اور مومن کا ذکر ہے ۔ یہ کتاب ۱۸۴۴ء میں دہلی سے شائع ہوئی ۔ اس میں ۲۰۲ صفحات ہیں اور ہر صفحے میں ۲۰ سطریں ہیں ۔

(جلد سوئم صفحہ ۲۰)

۱۸ ۔ "مسرت افزا : مصنفہ ابوالحسن الٰہ آبادی ۔ میرے پاس اس تذکرے کا خلاصہ ہے جو بلانڈ (Bland) مرحوم نے مجھے عنایت فرمایا اور جس کی بنیاد سر ڈبلیو ۔ اوسلے (Sir W. Ouseley) کا وہ مخطوطہ ہے جو اب آکسفرڈ میں موجود ہے ۔"

جلد اول صفحہ ۱۰۱ پر ابوالحسن کے بیان میں دتاسی لکھتا ہے کہ :

"مصنف کو امراء اللہ الٰہ آبادی بھی کہا جاتا تھا ۔ انھوں نے عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی ۔ کلکتے بھی گئے ۔ یہ تذکرہ انھوں نے ۱۱۹۳ ہجری (مطابق ۱۷۷۹ء) میں لکھا ۔ اس کے چند ایڈیشن لکھنؤ میں شایع ہوئے ۔

۱۹ ۔ "مجالس رنگین : (سعادت یار خان) اس میں ہم عصر شعرا اور شاعری پر تبصرہ ہے ۔"

۲۰ ۔ "مجموعۂ نغز : مصنفہ سید ابوالقاسم ، قاسم دہلوی ۔ یہ تذکرہ ان میں سے ہے جن سے معلومات حاصل کرکے

میں نے اس ایڈیشن میں اضافے لیے ہیں ۔ اس تذکرے اور دوسرے تذکروں میں فرق یہ ہے کہ قاسم نے لکھنے والوں کے نام گڈمڈ نہیں کر دیے ہیں ۔ ہم نام شعرا کے ناموں کو اس نے ایک جگہ جمع کیا ہے ، ہر ایک کا ایک شمارہ معین کیا ہے اور اسی کے لحاظ سے شعرا کا ذکر کیا ہے ۔ قاسم کے مضامین سرور اور شیفتہ سے تعداد میں کم ہیں لیکن زیادہ بصیرت افروز ہیں اور ان میں وہ واقعات اور حوالے ملتے ہیں جو دوسروں کے ہاں نہیں ملتے ۔"

قاسم کے حالات کے بیان میں دتاسی لکھتا ہے کہ :

"یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور ۱۲۲۱ ہجری مطابق ۱۸۰۶-۷ء میں لکھا گیا ۔ اس میں آٹھ سو لکھنے والوں کے حالات درج ہیں ۔"(جلد اول صفحہ ۳۵۴)

۲۱ ۔ "**مجموعة الانتخاب** : مصنفہ فقیر شاہ محمد کمال ۔ اس کتاب کو بھی میں نے ('تاریخ' کے) دوسرے ایڈیشن کے لیے استعمال کیا ہے ۔ اس میں انہاون نئے مضامین ہیں جن میں سے بیشتر بہت دل چسپ ہیں ۔ بدقسمتی سے جو مخطوطہ میرے پاس ہے اس کی تحریر نستعلیق ہونے کے باوجود صاف نہیں ہے ، اس لیے

منتخب اشعار سے استفادہ کرنے میں مجھے آسانی دشواری پیش آئی ۔“

جلد دوم صفحہ ۱۴۵ پر اس تذکرے کے مصنف کی زندگی کے حالات دئے گئے ہیں ۔ یہاں مصنف کا دوسرا نام شاہ کمال الدین حسین بیان کیا گیا ہے ۔ دتاسی نے لکھا ہے کہ کمال کے اجداد کا وطن مانک پور تھا ۔ اس کے بعد وہ بہار چلے گئے اور مغل بادشاہوں کے زمانے میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے ۔ کمال نے نوجوانی ہی میں درویشی اختیار کرلی ۔ وہ بنگال گئے، اس کے بعد لکھنؤ، اور جب مصحفی نے اپنا تذکرہ لکھا تو وہ راجا آلاس رائے کے ساتھ رہتے تھے ۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ : ”وہ شاعری میں کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں ہیں لیکن کبھی کبھی جرأت کو اپنا کلام دکھاتے تھے ۔“ دتاسی نے کمال کی ایک ہجو کا ترجمہ پیش کیا ہے ۔ یہ ہجو راجا چیت سنگھ کی تھی ۔ اس راجا نے اپنے وزیر علی خاں کو انگریزوں کے حوالے کردیا تھا ۔ کمال نے اپنے حالات زندگی بھی ”مجمع الانتخاب“ میں لکھے ہیں ۔ دتاسی نے اس اقتباس کا ترجمہ صفحہ ۴۹-۵۳ پر دیا ہے ۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ مسٹر نوبولڈ (Newbold) نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو دیا ۔ کمال نے یہ تذکرہ ۱۲۱۹ ہجری (مطابق ۵-۱۸۰۴ع) میں لکھا تھا ۔ دتاسی نے لکھا ہے

کہ ۱۸۴۳ع میں مسٹر نیوبولڈ نے اسے ایک خط لکھا تھا جس سے معلوم ہوا کہ کمال اس وقت زندہ تھے اور ان کی عمر تقریباً ستر سال کی ہوگی۔ اس زمانے میں وہ مدراس پریزیڈنسی میں رہتے تھے جہاں نواب کرنول نے انھیں ایک جاگیر عطا کی تھی۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام محمد الف خاں تھا اور فارسی اور اردو شاعری کا دل دادہ تھا۔

۲۲ - "مجموعۂ واسوخت: اس بیاض میں مختلف شعرا کی اکیس نظمیں ہیں جو اڑسٹھ صفحات کے ایک چھوٹے سے کتابچے کی شکل میں لکھنؤ کے لیتھو پریس سے ۱۲۶۱ ہجری (مطابق ۱۸۴۹ء) میں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں حواشی بھی لکھے گئے ہیں۔"

۲۳ - "مخزن نکات یا نکات الشعرا: مصنفہ قیام الدین علی قائم۔ اس تذکرے کے تین حصے ہیں جنھیں طبقات کہا گیا ہے۔ اور اس طرح اسے طبقات الشعرا کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نام ایک اور کتاب کا بھی ہے جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ اس تذکرے سے مجھے بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئیں۔" جلد اول صفحہ ۳۶۱ میں دتاسی لکھتا ہے کہ: "اس تذکرے میں ایک سو دس شعرا کا ذکر ہے اور یہ ۱۱۶۶ ہجری (مطابق ۵۳-۱۷۵۲ع) میں لکھا گیا۔"

مخزن نکات فارسی میں ہے اور اس میں سعدی کو پہلی بار ہندوستانی شعرا میں شامل کیا گیا ہے۔ یہاں دتاسی نے اپنے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جس کا عنوان ہے "سعدی کو دیگر ہندوستانی شعرا میں شمار کیا گیا" یہ مضمون ژورنال آزیاتک ۱۸۴۳ء میں شائع ہوا ہے۔

۲۴ - "مختصر احوال مصنفین ہندی کے تذکروں کا یا رسالہ در باب تذکروں کا (کذا) : مصنف ذکاء اللہ دہلوی - یہ کتابچہ میرے مقالے "Auteurs hindustanis et leurs ouvrages" کا ترجمہ ہے۔"

منشی ذکاء اللہ کے بیان میں دتاسی نے اس تذکرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ۱۸۵۶ء میں دہلی سے شائع ہوا (جلد سوئم صفحہ ۳۵۲)۔

۲۵ - "لو رتن : ہندوستانی بیاض مصنفہ محمد بخش۔"

۲۶ - "نکات الشعرا : مصنفہ میر تقی میر، یہ اردو کا قدیم ترین تذکرہ ہے۔ اس کا مصنف اٹھارھویں صدی کے نصف آخر کے ممتاز مصنفین میں سے ہے۔ میں نے مصنف کے بارے میں اپنی کتاب کی سوانح عمری اور کتابیات سے متعلق حصوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔"

جلد دوئم صفحہ ۳۱۵-۲ میں دتاسی نے میر تقی میر

کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے ۔ اس کے علاوہ ان کے کلام کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے ۔ اس میں "شعلۂ عشق" دو ہجویات ، ایک غزل ، ایک قصہ ، ایک رباعی اور چار فرد شامل ہیں ۔ تذکرے کے بارے میں دتاسی لکھتا ہے کہ میر نے ایک سو دو شعرا کے حالات لکھے ہیں جو ریختہ میں شعر کہتے تھے ۔ یہ شعرا زیادہ تر وہ تھے جو شعر و شاعری کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے ۔ یہ محفلیں میر درد کے ہاں ہوتی تھیں ۔

۲۷ ۔ "روضۃ الشعرا : مصنفہ محمد حسین کلیم ، اس میں ہندوستانی شعرا پر نظمیں لکھی گئی ہیں، اس لیے اسے تذکرہ کہا جا سکتا ہے ۔"

۲۸ ۔ "سراپا سخن : مصنفہ محسن لکھنوی ، اس میں سات سو سے زیادہ ہندوستانی نظموں کے منتخب اشعار ہیں جنھیں موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا ہے اور شعرا کے مختصر حالات بھی دیے گئے ہیں ۔ یہ تذکرہ اس دوسرے ایڈیشن میں میرے بہت کام آیا ۔"

سید محسن علی موسوی محسن کے بارے میں دتاسی لکھتا ہے کہ :"یہ لکھنؤ کے ہیں ۔ سید شاہ حسین حقیقت کے فرزند اور سید عرب شاہ خواجہ وزیر کے پوتے ہیں جن کے

اجداد عرب سے آئے تھے۔ دلی میں آباد ہوئے۔ سراپا سخن ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا اور ۱۸۶۱ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس میں چار سو صفحات ہیں۔ (جلد دوئم، صفحہ ۲۶)"

۲۹۔ "سرو آزاد: اس تذکرے کا ذکر ابوالحسن نے اپنی کتاب "مسرت افزا" میں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ ابن مصنف نے اس کا ذکر فارسی تذکروں میں کیا ہے۔ یہ دونوں رائیں صحیح ہوسکتی ہیں۔ بعض ہندوستانی شعرا فارسی میں شعر کہتے تھے اور بعض ہندوستانی میں۔ آزاد خود ہندوستانی کے ممتاز شاعر تھے۔ میرے اندازے (کہ یہ تذکرہ اردو شعرا کا ہے) کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ آزاد ایک اور تذکرے کے مصنف بھی تھے جو فارسی شعرا کے لیے مخصوص ہے اور جس کا نام "خزانۂ عامرہ" ہے۔"

۳۰۔ "صحوف ابراہیم: اس کتاب کا نام مصنف خلیل نے اپنے نام پر رکھا۔ اس میں مجھے بہت سی معلومات ملیں جنہیں میں نے زیر نظر "تاریخ" میں استعمال کیا ہے۔"

جلد دوئم صفحہ ۱۹۱ پر دتاسی نے مصنف کا پورا نام نواب شرف الدین محمد علی ابراہیم خاں لکھنوی لکھا ہے جو خواجہ عبدالحکیم کے بیٹے اور نواب عاشور علی خاں بہادر

کے شاگرد تھے۔ خلیل محمد علی شاہ کے وزیر اعلیٰ اور ضلع بنارس کی عدالت دیوانی کے صدر رہ چکے تھے۔

۳۱۔ "طبقات الشعرا: مصنفہ قدرت اللہ شوق، اس کتاب کو بعض اوقات مختصراً تذکرۂ ہندی بھی کہا جاتا ہے۔"

۳۲۔ "طبقات الشعرا: مصنفہ کریم الدین، یہ تذکرہ جسے تذکرۂ شعرائے ہندی بھی کہتے ہیں دہلی میں ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ یہ میری کتاب "تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی" کا ترجمہ ہے۔ لیکن یہ بالکل علیحدہ کتاب ہے۔ اس کے لیے جو مواد میری کتاب سے لیا گیا ہے وہ فاضل مسلمان مصنف کو مسٹر ایف۔ فیلن کی معرفت حاصل ہوا جو آج کل بہار میں ناظم تعلیمات ہیں۔"

کریم الدین کے حالات زندگی اور تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے جلد دوئم صفحہ ۱۷۲ پر دوسرے دتاسی اس تذکرے کے بارے میں لکھتا ہے کہ: "یہ کتاب میری "تاریخ" کے پہلے ایڈیشن کی جلد اول سے ماخوذ ہے لیکن اس میں "گلشن بے خار" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو میری کتاب کی جلد اول کے تحریر کیے جانے تک شائع نہیں ہوئی تھی۔"

اس کے بعد دتاسی نے مختصر طور پر اس تذکرے کی

خصوصیات بیان کی ہیں - (جلد دوئم صفحہ ۲۷۱) -

۳۳ - "تذکرۂ سخن: مصنفہ غلام محی الدین عشق میرٹھی۔ اس تذکرے میں ریختی کے تقریباً سو شعرا کے حالات درج ہیں - میں یہ تذکرہ حاصل نہ کر سکا -"

۳۴ - "تذکرۂ اختر: مصنفہ واجد علی، کہا جاتا ہے کہ اس میں پانچ ہزار فارسی اور اردو شعرا کے حالات ہیں - اس تذکرے کے مصنف آخری تاجدار اودھ تھے جن کی بہت سی کتابیں میرے کتب خانے میں ہیں لیکن یہ تذکرہ نہیں ہے -"

۳۵ - "تذکرۂ عاشق: مصنفہ مہدی علی دہلوی -" مصنف کی دیگر تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے جلد اول صفحہ ۲۳۱ پر دتاسی نے لکھا ہے: "یہ تذکرہ ان شعرا کا ہے جو عاشق کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے -"

۳۶ - "تذکرۂ آرزو: مصنفہ صدرالدین۔ اس کا ذکر شیفتہ نے کیا ہے -"

۳۷ - "تذکرۂ گردیزی: مصنفہ فتح علی حسین۔ میں نے اس سے بہت استفادہ کیا -"

اس تذکرے کے بارے میں جلد اول صفحہ ۵۲۳ پر گارسیں دتاسی لکھتا ہے کہ: "یہ شمالی اور وسطی ہندوستان کے شعرا کا تذکرہ ہے - اس کا مخطوطہ ٹیپو سلطان کے کتب خانے میں تھا اور اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے

کتب خانے میں منتقل ہو گیا۔" دتاسی کے دوست کیپٹن ٹرائر (Troyer) نے اس مخطوطے کی نقل کر کے دتاسی کو بھیجی۔ اس کا ایک نسخہ ایسٹ انڈیا آفس میں سرجی اوسلے کے ذخیرے میں شامل ہے۔ دتاسی کے خیال میں یہ وہی تذکرہ ہے جو حضور نظام کے کتب خانے میں تذکرہ فتح علی خاں کے نام سے موجود ہے۔ اس میں تقریباً ایک سو شعرا کے حالات ہیں۔ یہ تذکرہ غالباً ۱۱۶۵ ہجری (مطابق ۲-۱۷۵۱ء) میں لکھا گیا کیونکہ گردیزی نے انجام کے حالات لکھتے ہوئے کہا ہے کہ انجام کا انتقال ۱۱۵۹ ہجری (مطابق ۱۷۴۶ء) یعنی تذکرے کے لکھنے سے چھ سال قبل ہوا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ تذکرہ قائم کے تذکرے سے تین سال قبل لکھا گیا۔ قائم کا تذکرہ "مخزن نکات" ۱۱۶۸ ہجری (مطابق ۱۷۵۴-۵۵ء) میں لکھا گیا۔ اس سے بھی گردیزی کے تذکرے کی تاریخ تحریر ۱۱۶۵ ہجری ہی ثابت ہوتی ہے۔ ذکا کے کہنے کے مطابق گردیزی شیخ اور صوفی تھے۔ قاسم اپنے تذکرے میں (جو ۱۸۰۶ء میں لکھا گیا) کہتے ہیں کہ گردیزی ان کے ہم عصر تھے؛ اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۰۶ء تک تو گردیزی زندہ تھے۔

۳۸۔ "تذکرۂ حسن: یہ تذکرہ سحرالبیان کے مشہور مصنف کا ہے۔ سرور کے تذکرے اور دیگر مصنفین نے

اس کا ادھر ذکر کیا ہے۔ لیکن مجھے اس کے بارے
میں کچھ معلوم نہیں۔"

۳۹۔ "تذکرۂ امام بخش: اس کے مصنف کشمیر کے رہنے
والے تھے۔ مصحفی نے اس کا ذکر کیا ہے اور
تعریف کی ہے کہ اس تذکرے میں بہت سی باتیں
ان کی تصنیفات سے چرائی گئی ہیں۔"

۴۰۔ "تذکرۂ عشقی: مصنفہ رحمت اللہ۔ میں نے اس تذکرے
سے بالواسطہ استفادہ کیا ہے۔ اس کا ذکر اسپرانگر
کے کیٹلاگ موسومہ Catalogue of the Libraries
of the King of Oudh میں کیا گیا ہے۔ اسپرانگر
کے پیش نظر جے۔ بی۔ ایلیٹ کا نسخہ تھا
جنھوں نے ہندوستانی کے بہت سے اچھے مخطوطات
جمع کیے ہیں۔"

جلد دوئم صفحہ ۴۷ میں مزید اضافہ کیا ہے کہ یہ
تذکرہ ۱۲۱۵ ہجری (مطابق ۱۸۰۰-۱ء) کے قریب لکھا
گیا۔ اس میں چار سو انتالیس شعرا کے مختصر حالات
ہیں۔ یہ تذکرہ چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر
سترہ سطریں ہیں۔

۴۱۔ "تذکرۂ جہاں دار: مصنفہ جوان بخت۔"

۴۲۔ "تذکرۂ خاکسار: محمد یار، شورش نے اس کا ذکر
کیا ہے۔"

۴۳ - "تذکرۂ محمود : حافظ ، ایک ہم عصر مصنف ـ"

۴۴ - "تذکرۂ مصحفی : غلام ہمدانی ، اس تذکرے میں ڈیڑھ سو ہندوستانی شعرا کا ذکر ہے اور یہ ان میں سے ہے جنھیں میں نے اپنی تصنیف میں بہت زیادہ استعمال کیا ہے ـ"

جلد دوئم صفحہ ۲۸۴ پر مصحفی کے بیان میں دتاسی نے پہلے مصحفی کے مختصر حالات زندگی لکھے ہیں پھر مصحفی کی چار تصنیفات کا ذکر کیا ہے جو یہ ہیں :-

۱ - "تین دواوین ہندوستانی : ان کا ایک نسخہ حیدر آباد کے چندو لال صاحب کے کتب خانے میں ہے -

۲ - "ایک اور ہندوستانی دیوان : جو انھوں نے دلی میں لکھا - یہ قصیدوں ، غزلوں اور مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے -

۳ - "تذکرہ شعرائے ہندی : یہ فارسی میں ہے - اس میں ایک ضمیمہ دیا گیا ہے جس میں مصنف خواتین کا بیان ہے - آخر میں تکمیل کتاب کے بارے میں دو تاریخیں دی گئی ہیں - (دتاسی نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ محسن کے بیان کے مطابق مصحفی نے دو ہندوستانی

تذکرے اور ایک فارسی تذکرہ لکھا تھا ۔)

۴ ۔ "شاہ نامہ : اس میں شاہ عالم تک کے بادشاہوں کا ذکر ہے ۔ ایک مخطوطہ موسومہ کلیات مصحفی فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں موجود ہے ۔ دتاسی لکھتا ہے کہ : "مصحفی کا ایک اور تذکرہ فارسی شعرا کا اور دو فارسی دیوان اور ایک تیسرا نامکمل دیوان بھی ہے ۔ لیکن میں یہ بات صرف حافظے کی بنا پر لکھ رہا ہوں ۔"

۴۵ ۔ "تذکرۂ مضمون (یا مظلوم) : مصنفہ امام الدین ۔"

جلد دوئم صفحہ ۳۰۲ پر گارسیں دتاسی نے سید امام الدین خاں مضمون کا مختصراً ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ سید معین الدین خاں کے فرزند تھے جو محمد شاہ کی فوج میں کمان دار تھے ۔ علی ابراہیم نے ان کے صرف دو شعر نقل کیے ہیں اور اسپرانگر نے عشقی کے حوالے سے بتایا ہے کہ ان کا تخلص مظلوم تھا ۔

۴۶ ۔ "تذکرۂ ناصر : سعادت خاں لکھنوی ۔"

جلد دوئم صفحہ ۴۲۱ پر دتاسی نے لکھا ہے کہ :" ناصر نگینے کے تھے، لکھنو میں آباد ہوئے ۔ مرزا محمد حسن عرف چھوٹے میاں کے فرزند اور شاگرد تھے ۔ یہ ایک تذکرے

انھوں نے ۱۲۵۰ ہجری (مطابق ۳۵ - ۱۸۳۴ء) میں وفات پائی ۔"

اب تک میں نے ان تذکروں کے بارے میں لکھا ہے جو گارسیں دتاسی کی "تاریخ" کے مقدمے کی فہرست میں شامل ہیں ۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں دتاسی نے اپنی "تاریخ" کی تین جلدوں میں بعض ایسے تذکروں کا بھی حوالہ دیا ہے جو مقدمے کی فہرست میں شامل نہیں ہیں ۔ ان تذکروں کا بیان حسب ذیل ہے :-

بہارستان ناز : مصنفہ حکیم فصیح الدین ، رئیس میرٹھ ۔ یہ ہندوستان کی قدیم و جدید شاعرات کے کلام کی بیاض ہے جس میں ان کے مختصر حالات بھی دیے ہوئے ہیں ۔ اس کا پہلا ایڈیشن میرٹھ میں ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا اور دوسرا اسی شہر سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا ۔ مصنف نے اس کتاب کا ایک نسخہ میرے دوست محمد وجاہت علی خاں کی درخواست پر مجھے عنایت فرمایا ہے ۔ اس کتاب میں ۷۶ صفحات ہیں اور ہر صفحے میں ۱۵ سطریں ہیں ۔ اس میں اکہتر شاعرات کے حالات مع نمونۂ کلام تحریر کیے گئے ہیں ۔ (جلد دوئم صفحہ ۵۶۴)

مجمع النفائس : سراج الدین علی خان ، مصنف کے حالات اور تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے دتاسی نے اس تذکرے

کا ذکر کیا ہے اور لکھتا ہے کہ : "یہ تذکرہ فارسی میں ہے اور ۱۱۶۴ھ (مطابق ۵۱-۱۷۵۰ ع) میں لکھا گیا ہے ۔"

اقبال نامہ : (سید شمس علی قمر آبادی) یہ سیر المتاخرین کا ترجمہ ہے ۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتے کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ ہے جس کا ذکر اس کتب خانے کے کیٹلاگ میں کیا گیا ہے ۔ یہ ترجمہ دلی میں طبع ہوا اور Report of public instruction کے ضمیمے میں شامل ہے ۔ (صفحہ ۲۸۴)

میرحسن کا تذکرہ : جلد اول صفحہ ۲۳۵ پر میرحسن مصنف مثنوی سحرالبیان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے دتاسی لکھتا ہے کہ انہوں نے اردو میں لکھنے والوں کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا ۔

طبقات سخن : (غلام محی الدین عشق میرٹھی) جلد دوئم صفحہ ۵۴ پر دتاسی لکھتا ہے کہ : "ہندوستانی شعرا کا یہ تذکرہ فارسی میں ہے جو ۱۲۲۲ھ (مطابق ۸-۱۸۰۷ع) میں لکھا گیا ۔ اس کے دو حصے ہیں جنھیں "طبقات" کہا گیا ہے ۔ پہلے حصے میں ریختہ‌گو شعرا کے حالات ہیں اور دوسرے حصے میں فارسی‌گو شعرا کا ذکر ہے ۔"

گلشن سخن : (مراد علی مبتلا) جلد دوئم صفحہ ۳۴۴ پر دتاسی لکھتا ہے :" کہ مبتلا محمد علی خاں کے بیٹے تھے

جو سرکار غازی پور کے امرا میں سے تھے ۔ مبتلا کی دو تصانیف کا ذکر دتاسی نے کیا ہے ۔ ایک دیوان اور ایک تذکرہ موسومہ گلشن سخن ۔"

نادر کا تذکرہ: جلد دوئم صفحہ ۲۴۵ پر مرزا کاب حسین خاں بہادر کے مختصر حالات لکھتے ہوئے دتاسی نے بیان کیا ہے کہ: "موصوف نواب احترام الدولہ دبیر الملک کلب علی خان، خان بہادر، ہبت جنگ، رئیس بنارس کے صاحب زادے تھے ۔ نادر پہلے ایٹاوہ اور اس کے بعد فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر رہے ۔ شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے ۔ انھوں نے دیگر تصانیف کے علاوہ ایک تذکرہ موسومہ صولت نادری بھی لکھا ہے ۔"

ان تذکروں کے علاوہ بعض جگہ دتاسی نے کسی شاعر کا ذکر کرتے ہوئے صرف یہ لکھا ہے کہ: "اس کا ذکر فلاں کتاب میں کیا گیا ہے ۔" مثلاً جلد سوم صفحہ ۳۲۸ پر ذاکر علی ذاکر کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی شاعر تھے جن کا ذکر نساخ نے "دفتر بے مثال" میں کیا ہے ۔ اسی کتاب کا حوالہ ذوق کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی دیا گیا ہے ۔ دتاسی لکھتا ہے کہ: "دفتر بے مثال کی رو سے ذوق کی تاریخ وفات ۱۲۷۱ ہجری (مطابق ۱۸۵۴-۵۵ع) قرار پاتی ہے ۔" (جلد سوئم ۔ صفحہ ۳۴۰)

ان تذکروں کے علاوہ دتاسی نے اپنی "تاریخ" کی تیسری جلد کے آخر میں "نسخۂ دل کشا" کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اس تذکرے کا نصف حصہ شایع ہو چکا تھا ، باقی نصف حصے کا مخطوطہ مصنف خود نے دتاسی کو پیرس بھیج دیا تھا ۔ یہ مخطوطہ مجھے پیرس کی ببلیوتک ناسونال میں مل گیا ہے ۔ پاکستان آ کر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر وحید قریشی اسے شایع کرنا چاہتے ہیں ۔ چناں چہ میں نے اس مخطوطے کی مائیکرو فلم پیرس سے منگوا کر ڈاکٹر صاحب موصوف کو دے دی ہے ۔

گارسیں دتاسی نے ان تذکروں میں سے اکثر سے استفادہ کیا لیکن اسے شکایت ہے کہ ان میں سے بہت سے تذکرے زیادہ تسلی بخش نہیں ۔ چناں چہ "تاریخ" جلد اول صفحہ ۱۵ پر دتاسی لکھتا ہے کہ : "عام طور پر ان تذکروں میں صرف شاعر کا نام اور نمونے کے چند اشعار دیے جاتے ہیں ۔ جو شعرا زیادہ مشہور ہیں ان کے بیان میں بھی عموماً تاریخ پیدائش نہیں دی گئی ہے اور تاریخ وفات بھی مشکل سے ملتی ہے ۔ اور ان کی ذاتی زندگی کے حالات بھی نہیں ملتے ۔ ان کی تصنیف کے بارے میں بھی تفصیل نہیں ملتی ، حتیٰ کہ بعض اوقات تصانیف کے نام تک نہیں دیے گئے ۔ بعض جگہ محض یہ لکھ دینے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ فلاں شاعر صاحب دیوان ہے ۔

تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی گارسیں دتاسی کی اہم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے ۔ افسوس ہے کہ ابھی تک اس کا اردو ترجمہ شایع نہیں ہوا ۔ یہ کام جب بھی کیا جائے ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گا بشرطیکہ ترجمہ مکمل اور معتبر ہو ۔

میرا خیال ہے کہ ابھی تک ہم نے اردو زبان و ادب کے اس محسن کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔ سیدہ ثریا حسین نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں دتاسی کی ایک سو پچپن تصانیف کا حوالہ دیا ہے[1] ۔ ان میں ادب ، تاریخ ، قواعد ، لسانیات وغیرہ پر کتابیں ، خطبات ، رسالے ، مقالات اور مضامین شامل ہیں ۔ ان تصانیف میں سے صرف خطبات کا ترجمہ اردو میں ہوا ہے ، باقی تصانیف فرانسیسی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے ہمارے اہل علم کی نظروں سے پوشیدہ ہیں ۔ خطبات ہی کو لے لیجیے ، ان میں انیسویں صدی کے ہندوستان میں اردو ادب کی تاریخ پر نہایت گراں قدر مواد ملتا ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتا ۔ یہ وہ دور تھا جب اردو زبان کی مخالفت شروع ہو چکی تھی ۔

---

(۱) ملاحظہ ہو

Garcin de Tassy :
"Biographie et etude critique de ses oeuvres"
مطبوعہ Institut Francais d'Indologie پانڈیچری ۔
صفحہ ۱۴-۲۰۸

گارسیں دتاسی نے اردو کی مخالف تحریکوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور پیرس میں بیٹھ کر اردو کی مدافعت اس جوش اور ولولے سے کی ہے جس کی نظیر محسنین اردو کی تاریخ میں بہت کم ملے گی ۔ دتاسی اس ملک کا باشندہ تھا جس کی زبان اور ادب کو علمی دنیا میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے ، لیکن اس نے اردو زبان کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی اور اردو ادب کے حسن و بلاغت پر صفحے کے صفحے تحریر کیے ، اور اردو شعرا کے تذکرے کے ایک بڑے حصے کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ۔ افسوس ہے کہ جس زبان کی فرانس میں اتنی قدر ہوتی تھی وہ آج سو سال کے بعد بھی بعض حضرات کی نظروں میں حقیر اور کم مایہ سمجھی جاتی ہے ! لیکن اس سے زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمارے اہل علم نے بھی دتاسی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔ اردو ادب کی تاریخوں میں (اگر انہیں "تاریخ" کہنا صحیح ہے) دتاسی کا ذکر محض برائے نام ملتا ہے ۔ بعض جگہ اس کے بارے میں اظہار رائے میں غلو کیا گیا ہے ؛ اس کی تعریف میں بھی اور مذمت میں بھی ۔ مثلاً ڈاکٹر زور نے اپنے رسالے موسومہ "گارساں دتاسی" میں خوش عقیدگی کے جوش میں یہ لکھ دیا کہ دتاسی فرانس کی اکادمی کا ممبر تھا ، حالانکہ یہ اعزاز اسے کبھی نہیں ملا۔ قاضی عبدالودود دتاسی سے اتنے خفا ہوئے کہ اس کی کم

مصنفین کی فہرست ہی سے خارج کر دیا۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اس کی تصانیف پر جو ذہن کیا جانا چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ دتاسی کی مختلف تصانیف میں جو معلومات ملتی ہیں انہیں جمع کر کے ان کا تجزیہ کیا جانا چاہیے تاکہ اردو ادب کا مورخ اس سے استفادہ کر سکے۔ ملک کی حکومت اور ادبی انجمنیں اس طرف توجہ فرمائیں تو یہ کام زیادہ مشکل نہیں۔

---

(۱) ''تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی'' — [illegible]
تیسرا شمارہ، دسمبر [illegible]۔

نسخۂ دلکشا

(ایک نادر تذکرہ)

جب میں نے نگار کا "تذکروں کا تذکرہ نمبر" پڑھا تو اس سے بہت معلومات حاصل ہوا۔ اس اشاعت میں اردو زبان میں تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا گیا ہے۔ لیکن تذکروں کی فہرست میں مجھے ایک ایسے تذکرے کا ذکر نہیں ملا۔ یہ تذکرہ "نسخۂ دلکشا" ہے جس کا مخطوطہ اور مطبوعہ نسخہ میں نے پیرس میں دیکھا۔ پاکستان واپس آ کر میں نے اس کے بارے میں اہل علم سے دریافت کیا لیکن کچھ پتا نہ چلا۔ جب میں نے نگار کے تذکرہ نمبر میں بھی اس کا ذکر نہ پایا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ نادر تذکرہ ہے۔ اس لیے میں اس کے بارے میں چند معلومات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

پیرس میں قیام کے دوران میں سرکاری فرائض کے … نے اردو زبان کے بارے میں کچھ معلومات

فراہم کی ہیں ۔ اس مواد کو میں علیحدہ مرتب کر رہا ہوں[1] ۔ اس کام کے سلسلے میں میں نے پیرس کے دو مشہور کتب خانوں ببلوتک ناسیونال اور میوزیے گیمے میں اردو مخطوطات پر نوٹ لکھے ہیں جنہیں شائع کیا جا سکے گا ۔ جب میں میوزیے گیمے کے مخطوطات پر نوٹ لکھ رہا تھا تو تذکرہ "نسخۂ دلکشا" کا مخطوطہ میری نظر سے گزرا ۔ میوزیے گیمے میں اس مخطوطے کا کیٹلاگ نمبر ۶۹۶ ہے ۔ یہ تذکرہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اردو شعرا کے بارے میں ہے ۔ شعرا کے حالات بہ ترتیب حروف تہجی درج ہیں ۔ یہ مخطوطہ اصل نسخے کا دوسرا حصہ ہے جس میں ان شعرا کا تذکرہ اس میں شامل ہے جن کے نام "ک" اور اس کے بعد کے حروف تہجی سے شروع ہوتے ہیں ۔ مصنف کا نام مخطوطے میں درج نہیں ۔ اس تذکرے کے پہلے حصے کا ایک مطبوعہ نسخہ پیرس کے کتب خانے ببلیوتک ناسیونال میں موجود ہے (کیٹلاگ نمبر ۳۶۸ - وائی - اے) ۔ مصنف کا نام جنم جے متر تھا ۔ دادا کا نام بہوبر متر بہادر ۔ کلکتے کے رہنے والے تھے ۔ اس تذکرے کا ذکر گارسیں دتاسی نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی" کے دوسرے

---

(۱) اس سلسلے میں میرا ایک مضمون "اردو کی بابت فرانسیسیوں کی چند تحریریں" اس کتاب کی ابتدا میں ہے ۔

اڈیشن کے[1] دیباچے میں اور اس کے بعد آخر میں ''بعد تحریر'' (Post Scriptum) کی حیثیت سے دیا ہے اور لکھا ہے کہ :''یہ تذکرہ مجھے اس وقت ملا جب اس تاریخ کی تیسری جلد کی طباعت پوری ہو چکی تھی - یہ کتاب کلکتے میں ۱۸۷۰ء میں طبع ہوئی - اس کتاب میں پانچ سو ستاسی[2] اردو زبان میں لکھنے والوں کے حالات درج ہیں - کل صفحات دو سو دس ہیں ، ہر صفحہ بیس سطروں کا ہے - پہلا حصہ ان شعرا کے بارے میں ہے جن کے نام ''ک'' اور اس سے پہلے حروف تہجی سے شروع ہوتے ہیں - دوسرے حصے میں باقی شعرا کا تذکرہ بہ اعتبار حروف تہجی کیا گیا ہے - یہ تذکرہ بابو راجندر لال مترکے والد جنم جے متر المتخلص بہ ارمان کا لکھا ہوا ہے -'' گارسیں دتاسی نے دیباچے میں لکھا ہے کہ : ''نسخۂ دل کشا'' انہیں مصنف جنم جے متر کے بیٹے راجندر لال متر کے توسط سے ملا - بابو راجندر لال متر اپنے علمی اور تحقیقی کام کی وجہ سے مشہور ہیں - انہوں نے

---

(۱) ملاحظہ ہو :
"Histoire de la Litterature Hindouie et Hindustanie"
جلد سوم - دیباچہ اور صفحہ ۳۵۸ -

(۲) یہ عدد غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ خود گارسیں دتاسی نے جن شعرا کا حوالہ دیا ہے (اور جن کے نام اس مضمون کے آخر میں درج کیے گئے ہیں) ان کی تعداد ۱۵۱ ہے-

ہندوؤں کے کریا کرم کی رسوم پر تحقیق کی ہے ۔ متھرا میں قدیم تحریروں کو پڑھنے اور ان کے مطالب کی توضیح کا کام سرانجام دیا ہے ۔ بنگال کے نسب خانے میں سنسکرت کے مخطوطات پر نوٹ تحریر کیے ہیں[1] ۔

---

(۱) ۔ اس تذکرے کا ذکر گارسیں دتاسی نے اپنے ۱۸۷۰ء کے مقالے میں بھی کیا ہے ۔ گارسیں دتاسی لکھتا ہے :
"بابو جنم جیا مترا کا تذکرہ جس کا نام "سخن دل کشا" ہے اس کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے ۔ لیکن مصنف کے بے وقت انتقال کی وجہ سے ماباقی اجزا کی طباعت کا کام روک لیا گیا ہے ۔ بابو صاحب مشہور فاضل راجندر لال مترا کے والد تھے ۔ اس تذکرے میں ہندوستانی کے شعرا کا حال بیان کیا گیا ہے ۔ اس میں ۶۷۷ شاعروں اور ۱۳ شاعرات کا حال قلم بند کیا گیا ہے جو ۱۱۰۳ھ سے لے کر ۱۲۶۸ھ یعنی ۱۸۵۲ء تک گزرے ہیں ۔ ہر ایک کے کلام کی مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔ بابو راجندر لال مترا نئی روشنی کے آدمی ہیں ۔ نہ معلوم وہ اس تذکرے کو پورا چھپوائیں گے یا نہیں ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید وہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کریں ۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس حصے کی جو اب تک

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد ڈرسٹی تاسی نے ان شعرا کی فہرست دی ہے جن کے نام اس تذکرے میں ہیں۔ فہرست اس مضمون کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔ مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم تذکرے کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار نے شعرا کے کلام کے نمونے پیش کرنے میں اچھے ذوق کا ثبوت دیا ہے۔

"دل تخلص، بندہ شاہ نہال ... بیٹے کا، شاہجہان پور کے۔ صوبہ بہار میں کئی بست ... اور منصب ... بادشاہی تمام بنگالہ کے تھے، اور اس کے بعد لکھنؤ میں جا کر موسن راجا جولاسن رائے کے ہوئے۔ شعر شاعران قدیم کے بہت جمع کیے تھے اور ... کہتے تھے:

شب وصال میں جب روز غم کی بات چلی
خروش مرغ سحر نے کہا کہ رات چلی"

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)
چھپا نہیں ایک قلمی نقل بھیج دیں گے۔ لیکن وعدہ ابھی پورا نہیں کیا گیا ہے"
لیکن بعد میں ... جنم مترا نے اپنا وعدہ وفا کیا اور ... کہ میں ... کیا وہ مخطوطہ ببلیوتک ناسیونال میں موجود ہے

''کنور تخلص ، نام راجا پورب کشن بہادر یکے از پسران راجا کشن بہادر۔ صاحب دیوان و مصنف شاہنامہ شان ہند۔ باشندے کلکتہ :

آدمی دل کا جو آنکھوں سے شرارا چمکا
لوگ سمجھے کہ فلک پر سے ستارا چمکا
درد فرقت میں جو شب دل کو ہوئی بیتابی
رات رونے میں کٹی صبح کا تارا چمکا
چہرہ از بسکہ بھبوکا سا نظر آتا ہے
ان دنوں نام خدا رنگ تمھارا چمکا''

''مست تخلص ، نام منشی عالم خاں ، موطن دہور شاگرد مولوی فرد کے :

آج دلبر کو خواب میں دیکھا
نور حق کو حجاب میں دیکھا
خود فنا ہو کے ذات میں ملنا
یہ تماشا حباب میں دیکھا
آپ کو سوخت غیر کو لذت
یہ مزا ہم کباب میں دیکھا''

''چنیا بیگم ، بیٹی مرزا بہادر کی اور بیوی شاہ بہادر کی تھیں :

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے''

"دلہن بیگم، بیٹی نواب انتظام الدولہ، مادر اور زوج آصف الدولہ کی تھیں:

بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے اللہ دل [illegible]
بری ہی راہ میں جاتا ہے قافلہ دل [illegible]

وصل کی شب ہے شرم سے ہوتا سر [illegible] اوپر دونوں کا
شمع کو کل اے صرصر [illegible] ار دے حال ہے ابتر دونوں کا

ہم کو تریاق کے دھوکے میں وہ سم دیتے ہیں
ہائے قسمت کہ دم نزع بھی دم دیتے ہیں"

یہ تذکرہ خصوصاً اس لیے اہم ہے کہ یہ ایک [illegible] اس وقت لکھا جب ہندوستان میں مسلمانوں [illegible] حکم تھا اور اس کے ردعمل کے طور پر اردو زبان کی مخالفت کی مہم شروع ہو چکی تھی۔ اگر یہ تذکرہ پاکستان و ہندوستان میں نایاب یا کمیاب[1] ہے

---

(۱) اس مضمون کے رسالہ 'نگار' میں شائع ہونے کے بعد اورینٹل کالج لاہور کے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب مجھ سے ملے اور [illegible] اس تذکرے کے پہلے حصے [illegible] پنجاب یونیورسٹی لائبریری [illegible]

تو اسے دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس کے بارے میں اہل نظر کے مشورے کا منتظر رہوں گا ۔

جن شعرا کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں :

سب سے پہلے گارساں دتاسی نے نو بادشاہوں کے کلام کا حوالہ دیا ہے جن کا ذکر تذکرے میں کیا گیا ہے :

آفتاب : شاہ عالم بن عالمگیر ثانی المتخلص بہ عالی گوہر[1] ۔

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)
اس کے دوسرے حصے کا پتا نہیں چل رہا ہے حال میں میں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے اس تذکرے کے حصے کے مخطوطے کی مائکروفلم پیرس سے منگوانے کا انتظام کر دیا ہے ۔ اس مخطوطے میں ان شعرا کا ذکر ہے جن کے نام 'ک' اور اس کے بعد کے حروف سے شروع ہوتے ہیں ۔ (اور جس کا ذکر میں مضمون کے شروع میں کر چکا ہوں) اس طرح یہ تذکرہ غالباً پہلی بار مکمل صورت میں شائع ہوگا ۔

(۱) شاہ عالم کے فارسی دیوان "دیوان آفتاب" کا مخصوصہ ببلیوتک ناسیونال پیرس میں موجود ہے ۔

ظفر : ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ۔
آصف : آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں نواب اودھ المعروف
بہ مرزا اماں ۔

دیگر شعرا کے نام یہ ہیں :

تخلص و نام

آباد : مہدی حسین خاں لکھنوی
آبرو : نجم الدین عالی خاں المعروف بہ شاہ مبارک
آتش : خواجہ حیدر علی لکھنوی
آثمی : خواجہ برہان الدین دہلوی
آدم : جہاں گیر خاں فرخ آبادی
آرام : خیر اللہ خاں
آرزو : سراج الدین علی خاں
آزاد : محمد فاضل دکنی
آزاد : میر مظفر علی دہلوی
آزاد : اوم
آشفتہ : مرزا رضا علی لکھنوی
آشفتہ : بھورے خاں جوان
آشفتہ : ناظر عبداللہ سلہٹی
آشنا : میر زین العابدین دہلوی
آشنا : عبدالکریم خاں کلکتوی

آفاق : میر فریداندس

آفت :

آگاہ : نور [illegible]

آگاہ : محمد صلاح [illegible]

آوارہ : [illegible]

آہ : [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بار مکمن [illegible]

(۱) شاہ عالم کے [illegible]

ببلیوتک ناسیونال پیرس

ارمان : ھنہ جیا متراکلکتوی مصنف تذکرۂ ہلذا

اسد : میر امانی دہلوی

اسد : نواب اسد اللہ خاں دہلوی جو مرزا نوشہ و
صاحب کے نام سے بھی مشہور ہیں ۔

اسیر : حافظ کرامت علی لکھنوی

اشتیاق : شاہ ولی اللہ سرہندی

اشرف :

اشرف : محمد اشرف

اشرف : میر اشرف علی لکھنوی

اشفاق :

اصغر : [illegible]

اظفر : [illegible]

اظہر : [illegible]

اظہر : [illegible]

اعظم : [illegible]

اعلیٰ : [illegible]

افسانہ :

[illegible]

افغان : الف خاں
الکر : میر جیون
اکبر : دہلوی المعروف بہ بھجھو شاہ
اکرام :
اکرام : خواجہ محمد اکرام دہلوی
الم : صاحب میر مرشدآبادی
الہام : شیخ شرف الدین لکھنوی
الہام : فضیل بیگ
امامی : خواجہ امام بخش پٹنہ
امانی : میر امانی مرشد آبادی
امجد : مولوی دہلوی
امداد : رامپوری
اُمی : دہلوی
اُمید : قزلباش ایرانی
اُمید : امید علی ہگلی
امیر : محمد یار خاں
امین : امین الدین خاں
انتظار : علی تقوی خاں مرشدآبادی
انجام : نواب امیر خاں دہلوی
اندوہ : دہلوی
انسان : اسد اللہ خاں دہلوی

انشاء : میر انشاء اللہ خاں مرشد آبادی
انصاف :
انور : شیخ عبداللہ قنوجی
انور : غلام علی کالپی
اوباش : امیر الزماں بجنوری
اولی : میر اولاد علی
اولیا : میر اولیا لکھنوی
ایمان : دکنی
باقر : باقر علی خاں
بحر : امداد علی لکھنوی
برق : محمد رضا
برق : میاں شاہ جیو
برش :
بسمل : گدا علی بیگ فیض آبادی
بسمل : سید جبار علی چنار گڑھ
بسمل : نام نامعلوم
بسمل : امیر حسین خاں بلگرامی
بشیر : بشارت علی دہلوی
بشیر : بشیراللہ کانپوری
بقاء : بقاءاللہ خاں اکبرآبادی
بکھاری: بکھاری لال دہلوی

بلهار :
بہادر : مرزا معزالدین
بہادر : مرزا جواں بخت
بہار : منشی ٹیک چند دہلوی
بیان : خواجہ احسان اللہ خاں اکبرآبادی
بیباک : میر نجف علی کوٹل
بیباک : میاں بشیر احمد رامپوری
بیتاب : محمد اسماعیل دہلوی
بیتاب : شاہ محمد علیم الٰہ آبادی
بیتاب : سنتوش رائے
بیجان : عزیز خاں افغانی
بیجان : الٰہی بخش داناپوری
بیخود : نرائن داس
بیدار : میر محمد علی عرف میر مہدی
بیدار :
بیدل : مرزا عبدالقادر
بیرنگ : دلاور خاں دہلوی
بیقید : سید فضایل علی خاں ٹھٹہ
بیکل : سید عبدالوہاب دولت آبادی
بیمار : شیخ الٰہی بخش رامپوری
بیمار : دہلوی

بینوا : سنام پٹنہ
پاک باز : میر صلاح الدین
پروانہ : راجا جسونت سنگھ عرف کاکا جی
پروانہ : پروان علی شاہ مراد آبادی
پریشان : نیاز علی لکھنوی
پریشان : واحد علی اٹاوہ
پنچھیا : دہلوی
پیام : شرف الدین علی خاں دہلوی
تاباں : عبدالحئی دہلوی
تانا : ابوالحسن شاہ بادشاہ دکن
تبسم :
تجرد : میر عبداللہ دکنی
تجلی : میاں حاجی
تحسین :
ترقی :
تسکین : میر سعادت علی
تسکین : میر حسین دہلوی
تسلی : لالہ ٹیکا رام
تسلیم : شیخ مہدی بخش پٹنہ
تصور : سید حسین خاں
تصور : احسان علی

تصویر : شاہ جواد علی مرشد آبادی
تقی : سید محمد تقی
تمکین : صلاح الدین دہلوی
تمنا : خواجہ محمد علی
تنہا : محمد عیسیٰ دہلوی
تنہا :
ثابت : اصالت خاں پٹنہ
ثابت : مرزا معزالدین خاندان شاہی دہلی
ثاقب : شہاب الدین
ثنا : میر شمس الدین پٹنہ
جان : میر یار علی لکھنوی
جان : عالم خاں
جرأت : یحییٰ امان قلندر بخش لکھنوی
جرأت : میر خیر علی دہلوی
جعفر : میر دہلوی
جگن : میاں دہلوی
جگنو : میاں
جنون : دہلوی
جنون : شیخ غلام علی مرتضیٰ سہسرامی
جوان : مرزا کاظم علی دہلوی
جودت : پروی رام مرشد آبادی

جوش : رحیم اللہ دہلوی
جوشش : محمد عابد پٹنہ
جولان : بہادر علی شاہ دہلوی
جوہر :
جہاں‌دار : جہاں‌دار شاہ پسرعالمگیر ثانی
چرکین : لکھنوی
حاتم : ظہورالدین دہلوی معروف بہ حاتم
حاتم : محمد دہلوی
حاجی :
حاصل : محمد واصل کانپوری
حافظ : ضامن شاہ رام پوری
حامد : گمنڈی لال منگھیری
حامد : میر لکھنوی
حبیب : حبیب اللہ
حبیب : حبیب مولا حیدرآباد دکن
حجام : عنایت‌اللہ دہلوی
حزین : محمد علی
حزین : ابوالخیر دہلوی
حزین : میر محمد باقی
حسرت : مرزا جعفر علی لکھنوی
حسرت : میر محمد حیات قلی خاں

حسن : میر غلام حسن دہلوی
حسن : میر محمد حسن دہلوی
حسن : خواجہ بریلوی
حسن : حکیم مولوی احمد حسن کلکتوی
حسینی :
حشمت : محتشم علی خاں دہلوی
حشمت : محمد علی دہلوی
حضور : شیخ غلام یحییٰ پٹنہ
حضور : لالہ بال مکند دہلوی
حقیقت : میر شاہ حسین بریلوی
حکیم : محمد پناہ
حیدر : غلام حیدر
حیدر : میر حیدر شاہ دکنی
حیدری : میر حیدر بخش دہلوی
حیرت : میر مراد علی مراد آبادی
حیف : میر چراغ علی
حیف : موتی لال لکھنوی
خادم : خادم حسین خاں پٹنہ
خادم : خادم علی شاہ کلکتوی
خاشاک :
خاکسار : محمد یار المعروف بہ شاہ خاکسار دہلوی

خان : عبداللہ خاں دانا پوری
خدمت : فرحت علی لکھنوی
خسرو : ابوالحسن
خاکی : کانپوری
خالق : میر مستحسن
خالق : مرزا ظہور علی مرشد آبادی
خلق : میر احسان
خلیل : دوست علی لکھنوی
خواجہ : خواجہ نجف علی ہگمی
خورشید : خوبنوقت علی لکھنوی
خورشید : مرزا حسن علی مرشد آبادی
خیال : غلام حسین
دارا : پسر بہادر شاہ ثانی شاہ دہلی
دانا : فضل علی
داؤد : مرزا
دائم : دائم علی کلکتوی
درخشاں : منگو بیگ فیض آبادی
درد : خواجہ میر درد دہلوی
درد : میر کرم اللہ خاں
درد مند : محمد دکنی
دل : محمد عابد پٹنہ

دل : فتح محمد
دلبر :
دلسوز : خیراتی خاں
دوست : غلام محمد مرشد آبادی
دیوانہ : سرب سنگھ لکھنوی
ذاکر : حسین دوست مراد آبادی
ذاکر : مولوی ذاکر علی بنارسی
ذرہ : جین داس
ذکا : منشی اتواری لال
ذکا : خوب چند
ذکی : نواب بہادر
ذوق : ابراہیم دہلوی
ذوقی :
ذہین : میر محمد مستعد
راجا : راجا راج کرشن بہادر کلکتوی
راسخ : طالب حسین
راسخ :
راغب : محمد جعفر خاں پٹنہ
راقم : برندابن
رخشاں : محمد چاند
رخصت : میر قدرت‌اللہ لکھنوی

رسائی :

رسم : رستم علی خاں بنارسی
رستم : رستم علی انبالوی
رسوا : آفتاب رائے
رشک : میر علی اوسط لکھنوی
رشید : لکھنوی
رضا : محمد
رضا : رضا علی
رضا :
رضی : سید رضی خاں
رفاقت : مرزا مکھن
رفعت : شاہ رؤف احمد
رفعت : شیخ محمد رفیع پٹنہ
رفعت : مولوی غلام جیلانی رامپوری
رفیق : پٹنہ
رقت : مرزا قاسم علی دہلوی
رقت : مولوی حبیب‌النبی رام پوری
رمز : مرزا محمد سلطان شہزادہ دہلی
رند : رائے کھیم نرائن دہلوی
رند : نواب مہربان خان لکھنوی
رند : شاہ ہمزہ علی دہلوی

رنگ :
رنگین : دہلوی کشمیری
رنگین : مرزا امان بیگ
رنگین : سعادت یار خاں تورانی
رواں : سید جعفر علی لکھنوی
روح‌الامین : روح الامین دہلوی
رونق : سیٹھ باپوجی بمبئی
رویت : مولوی حبیب احمد بھوپال
رہائی : شیخ عبداللہ رنگون
زار : میر جیون کشمیری
زار : مغل بیگ
زار : میر مظہر علی
زکی : جعفرعلی خاں
زماں : سید محمد زمان امروہوی
ساقی : میر حسن علی
ساماں : میر ناصر
سائل : مرزا محمد یار بیگ
سایہ : سلیم دہلوی
سبقت : مرزا مغل دہلوی
سہاھی : میر امام بخش
سجاد : میر

سخن : محمد حسین خاں
سراج : میر سراج الدین دکنی
سرسبز : مرزا زین العابدین خاں
سرشار : ملول چند
سرور : میر محمد خاں
سرور : حمایت اللہ خاں
سرور : مرزا رجب علی بیگ
سعادت : میر سعادت علی امروہوی
سعدی : سعادت‌اللہ دکنی
سکندر :
سلام : نجم‌الدین علی خاں
سلطان :
سلطان : طالب علی خاں
سُلیم : میر محمد سلیم پٹنہ
سلیمان : مرزا محمد لکھنوی
سلیمان :
سمجھو :
سودا : مرزا رفیع لکھنوی
سوز : سید محمد میر لکھنوی
سوزاں : مولوی غلام مرتضیٰ رام‌پوری
سید : امام الدین دہلوی

سید : میر یادگار علی بارا پورہ
سید : سید رسول رام پوری
شاد : لالہ یار بیگ
شاد : محمد یار خاں رام‌پوری
شاداب : لالہ خوش وقت رائے چاند پوری
شاداب :
شادماں :
شاعر : میر کلو
شاغل : شاگرد بسمل
شافی : امین الدین پٹنہ
شاکر : محمد شاکر
شاہ : میر شاہ علی خاں دہلوی
شاہی : شاہ قلی خاں حیدرآباد دکن
شائق : منشی محمد بخش پٹنہ
شائق : میاں پیر محمد
شائق : خواجہ حیدر جان جہانگیرنگر
شجاعت :
شرر : مرزا ابراہیم بیگ
شرف : میر محمد
شریر : احمد جان دہلوی
شفا : حکیم یار علی

شفیع : میر محمد شفیع لکھنوی
شکوہ : محمد رضا
شکیبا : شیخ غلام حسین
شگفتہ : مرزا سیف الدین علی
شمیم : لکھنوی
شور : اسلوب بیگ
شورش : میر غلام حسین
شوریدہ :
شوق : حسن علی
شوق : مولوی قدرت‌اللہ رامپوری
شوکت : مرزا تصدق علی
شوکت : بنارسی
شہامت: شہامت خاں
شہرت : افتخارالدین علی خاں
شہرت : مولوی سعبدالنبی
شہرت : منشی غلام علی کلکتوی
شہرت : مرزا محمد علی دہلوی
شہید :
شہید : مولوی غلام حسین غازی پوری
شہیدی: منشی کرامت علی
شیدا : میر فتح علی شمس‌آبادی

شیدا : مولوی امانت‌اللہ کلکتوی
شیفتہ : نواب مصطفٰی خاں دہلوی
شیفتہ :
شیفتہ : حافظ عبدالصمد
صابر : صابر شاہ دہلوی
صاحب : نواب ظفریاب خاں
صاحب :
صاحب‌قران : امام علی لکھنوی
صادق : میر صادق علی دہلوی
صادق : مرزا صادق بیگ رام‌پوری
صادق : میر جعفر خاں دہلوی
صادق : صادق علی خاں پٹنہ
صالح : نالہ ، مصنف 'مہر و ماہ'
صانع : نظام‌الدین احمد بلگرامی
صبا : صبا شاہ شکارپوری
صبا : میر ضیا
صبر : لالہ اجودھیا پرشاد کلکتوی
صبر : میر محمد علی فیض‌آبادی
صحبت :
صدق :
صفا :

صفات : مغل جان لکھنوی
صفدر : صفدر علی سونی پتی
صفدری : میر صادق علی
صفدری : حیدرآباد دکن
صمصام : نواب امیرالامرا صمصام الدولہ محمد آثم
صنعت : مغل خاں
صنعت : کریم الدین مراد آبادی
صیفی : المعروف بہ شعلہ
ضاحک : میر غلام حسین دہلوی
ضبط : میر حسین شاہ
ضمیر : سید ہدایت علی خاں دہلوی
ضمیر : . . . . .
ضمیر : شیخ مداری اکبرآبادی
ضیا : ضیاالدین دہلوی
ضیا : مرزا ضیا بخت
ضیا : ضیاالدین
ضیا : وارث علی ڈھاکا
ضیغم : اکرام احمد رام‌پوری
طالب : امام‌الدین لکھنوی
طالب : طالب حسین خاں
طالب : حافظ شبراتی رام پوری

طالب : دکنی
طالب : میر طالب
طالع : شمس‌الدین لکھنوی
طائر : شیخ مکھوا اکبرآبادی
طپش : محمد اسماعیل کلکتوی
طرب : چھنو لال لکھنوی ـ نو مسلم
طرز : گردھاری لال امروہوی
طرہ : طرہ یار خاں بنارسی
طفل : مرزا عبدالمقتدر بہادر
طور : لکھنوی
ظاہر : خواجہ محمد جان دہلوی
ظاہر : میر محمد اکبرآبادی
ظفر : میر ظفر خاں
ظہور : لالہ شو سنگھ دہلوی
ظہور : ظہوراللہ بیگ تورانی
عاجز : عارف‌الدین خاں اکبرآبادی
عاجز : الف خاں
عاجز : زورآور سنگھ
عارف : محمد کشمیری
عارف : نواب زین‌العابدین خاں بہادر دہلوی
عارف : میر عارف علی مرادآبادی

عاشق : میر برہان‌الدین
عاشق : میر یحییٰ ۔ عاشق علی خاں
عاشق : علی اعظم خاں
عاشق : منشی عجائب رائے
عاشق : . . . . .
عاشق : پنڈت بخشی بھولا ناتھ
عاشق : رام سنگھ
عاشق : مہدی علی خاں
عاشق : شیخ نبی بخش اکبرآبادی
عاشق : مولوی جلال‌الدین
عاشقی : آغا حسین قلی خاں پٹنہ
عاصی : نور محمد برہان‌پوری
عاصی : منشی امداد حسین
عاصی : رامپوری
عاقل : عاقل شاہ دہلوی
عالم : کلکتوی
عالی : از خانوادۂ تیموری
عالی‌جاہ : پسر نواب نظام‌الملک بہادر
عبد :
عبد : عبداللہ دکنی
عبرت : سعیدالدین رامپوری

عبری : اسحاق صاحب کلکتوی
عبیدی : مولوی عبداللہ کلکتوی
عرفان : میر عباس لکھنوی
عزت : نیاز علی خاں بہادر حیدرآباد دکن
عزیز : شاہ عزیزاللہ
عزیز : . . . داس جونپوری
عزیز : مہاراجا سنگھ ناتھ
عزیز : شوناتھ دہلوی
عزلت : سید عبدالوالی سورتی
عسکری: مرشدآبادی
عشاق :
عشرت : غلام علی بریلوی
عشق : رکن‌الدین شاہ گھسیٹا پٹنہ
عشق : حکیم میر عزت‌اللہ خاں
عشق : شیخ غلام محی‌الدین میرٹھی
عشقی : مرادآبادی
عطش : احمد بخش ڈھاکا ۔ جہانگیر آباد
عظمت : عظمت‌اللہ خاں
عظیم :
عظیم : مرزا عظیم بیگ
علی : مرزا محمد علی کلکتوی

علی : مرزا علی قلی
علی : علی محمد خاں مرادآبادی
علی : حیدر
علی : گوہر
عمدہ : سیتا رام کشمیری
عمر : معتبر خاں دکنی
عنایت : عنایت علی خاں
عندلیب : لالہ گوبند سنگھ دہلوی
عیاش : میر یعقوب لکھنوی
عیاش : خیالی رام دہلوی
عیاذ : محمدامین ، مصنف 'نجات نامہ'
عیاں : مرزا ہاشم علی
عیسوی : طالب علی لکھنوی
عیش : مرزا حسین رضا لکھنوی
عیش : خدا بخش
عیش : مرزا محمد عسکری دہلوی
غازی : دکنی
غافل : رائے سنگھ
غافل : بختاور سنگھ مراد آبادی
غالب : نواب اسداللہ خاں بہادر
غالب : مکرم الدولہ بہادر بیگ خاں

غالب : نواب مرزا امان علی خاں پٹنہ
غالب : غالب علی خاں
غالب : طالب جنگ دہلوی
غربت : شیخ ناصرالدین احمد کشمیری
غربت : حکیم غلام نبی رام‌پوری
غربت : مراد آبادی
غریب : محمد زماں
غریب : میر محمد تقی دہلوی
غضنفر : غضنفر علی خاں لکھنوی
غفلت : غفلت آخند زادہ رام‌پوری
غلام : راجا گوپال ناتھ
غلامی : شاہ غلام محمد دہلوی
غم : میر محمد اسماعیل مرشدآبادی
غمگین : میر سید علی
غنی : شیخ عبدالغنی سہارن‌پوری
غواث : دکنی
غیرت : شاگرد جرأت
فارغ : لالہ مکند سنگھ دہلوی
فارغ : میر احمد خاں مہین پوری
فارغ : فارغ شاہ بریلوی
فخر : میر فخرالدین لکھنوی

فدا : سید امام‌الدین دہلوی
فدا : مرزا فدا حسین
فدا :
فدا : سید محمد علی بریلوی
فدا : میر عبدالصمد دہلوی
فدا : لکشمی رام دہلوی
فدا : عاقبت محمود خاں
فدا : مرزا عظیم بیگ
فدوی : عظیم الدین
فدوی : پٹنہ
فدوی : محمد محسن لاہوری
فدوی : مرزا بھچو دہلوی
فدوی : مکند لاہوری
فدوی : فضل علی
فرانسو: کپتان آکسٹن صاحب
فراغ : محمد فراغ دہلوی
فراق : مرتضٰی علی خاں دہلوی
فراق : میاں نثار علی
فراق : ہریم کشور
فرحت : شیخ فرحت‌اللہ ماوراءالنہر
فرحت : امیر علی دہلوی

فخر : کرامت‌اللہ خاں لکھنوی
فخر : میر فخر اٹاوہ
فخر : فخر بخش
فرد : وحیدالدین کان‌پوری
فرصت : مرزا الف بیگ الہ‌آبادی
فراقی : پٹنہ
فروغ : میر علی اکبر
فرہاد : میر بابر علی فیض‌آبادی
فریاد : لالہ صاحب رام لکھنوی
فصیح : مرزا جعفر علی لکھنوی
فضل : فضل مولا خاں لکھنوی
فضل : شاہ فضل علی
فضلی : افضل‌الدین خاں دکنی
فگن : میر شمس‌الدین دہلوی
فگن : اشرف علی خاں
فگن : ظریف خاں رام پوری
فقیر : میر شمس‌الدین دہلوی
فقیر : میر فقیراللہ
فقیہ :
فگار : میر حسین
فگار : مرزا قطب علی بیگ دہلوی

فنا : شیخ باقر کالپی
فہیم :
فیض : علی بخش
فیض : پنڈت کرپا کشن
فیض : میر فیض علی دہلوی
قابل : مرزا علی بخت خاندانۂ تیموری
قادر : سید خلیل دکنی ۔ دکن
قادر : مولوی عبدالقادر رامپوری
قادر : مرزا قادر بیگ کلکتوی
قاسم : دکنی
قاسم : الملقب بہ ابوالقاسم خاں لکھنوی
قاسم : حکیم قدرت‌الله خاں دہلوی
قاسم : سید قاسم علی خاں لکھنوی
قاسم : میر قاسم علی بریلوی
قاصر : مرزا باقر علی بیگ دہلوی
قابل : کان پوری
قائم : قائم‌الدین علی چاندپوری
قاتل : مرزا مہدی حسن دہلوی
قبول : عبدالغنی بیگ کاشمیری
قدر : محمد قدر دہلوی
قدرت : قدرت‌الله دہلوی

قدرت : مولوی قدرت‌الله رام‌پوری
قربان : میر جیون فیض‌آبادی
قربان : میر مہدی
قربان : میر قربان علی پٹنہ
قرار : جان محمد
قرار : میر حسین علی دہلوی
قربی : لکھنوی ۔ کشمیر نژاد
قسمت : شمس‌الدولہ
قلب :
قلق : کالپی
قلندر : لالہ بدھ سنگھ
قمر :
قمر : مرزا قمرالدین
قمر : میر قمر
قناعت : مرزا محمد بیگ لاہوری
کمترین : شاہ فرخ آبادی
کنور : راجا پروا کرشن بہادر
کھالسی : میر
گلشن : مرزا عظیم‌آبادی
لالہ :
ماہر : غلام نبی

مائل : مرزا یار محمد بیگ
مائل : مرزا قادر بیگ بریلوی
مجنوں : محمد حسین اٹاوی
محیب : غلام حیدر لکھنوی
محبت : میر قریش دہلوی
محزم : خواجہ محمد محزم خاں دہلوی
محزوں : مولوی ظہورالنبی رام‌پوری
محنت : منور علی لکھنوی
محوی : میر باسط علی الہ آبادی
مروت : قاسم علی لکھنوی
مست : منشی عالم علی خاں کان‌پوری
مسلم : میر فرزند علی کلکتوی
مسرت : شیخ رحمت علی بنارسی
مسرور : مرزا حبیب علی بیگ
مسرور : کشن راؤ
مسطور :
مشفق : راجا جاذب کشن بہادر
مضطرب: مولوی خلیل رام‌پوری
مطلب :
ملنگ : شاہ
ممتاز : حافظ فضل علی

منور : منور خاں رامپوری
منیر : میر امیر خاں عظیم‌آبادی
منیر : وحیدالدین
موزوں : نواب خواجم قلی خاں
مولوی :
مہجور : مولوی عبدالغفور
مہدی : نواب سید محمد مہدی علی خاں
مہرباں :
میر : مدداللہ پسر میر ہمزہ علی اثر
میزان : میر میزان
نثار : محمد امان آگرہ
نزہت : رفیع‌الدرجات رامپوری
نکہت : میاں نیاز علی بیگ دہلوی
نوا : شیخ ظہور
نوا : نواب ظہوراللہ خاں بدایونی
نواب : نصراللہ خاں رامپوری
نور : مولوی عبداللہ پانی پتی
نیاز : عبدالرسول جہانگیرنگر
واحد : واحد علی
والا : مظہر علی خاں
والہ : مبارک علی مرشدآبادی

وحشت : مولوی رشیدالنبی رام‌پوری
وزیر : خواجہ وزیر لکھنوی
وصل : مولوی محمد مظہر لکھنوی
ولی : مرزا محمد ولی
ہادی : میر محمد جواد سندیلوی
یار : میر محمد
یک‌رو : میاں یک‌رو

شاعرات

آبادی :
آفتاب : آفتاب بیگم لکھنوی
اچپل : آگین
الفت : پانی‌پتی
بیگم : تارا بیگم
جان :
جانی : بیگم جانی بنت قمرالدین خاں
جینا بیگم: بنت مرزا بابر بہادر
حجاب : بنی جان ہاپڑ، بنارس
حور : بی‌بی حور لکھنوی
زینت : بی‌بی دہلوی
شرم : کلکتہ

صاحب : شاگرد مومن خاں
قمر : الہ آبادی
ماہ : روشنی جان لکھنوی
مہتاب : بریلوی
نورن : نورجہاں فرخ آبادی

انکتیل دوپروں[1]

(اٹھارھویں صدی عیسوی کا ایک فرانسیسی محقق جو کچھ عرصہ ہندوستان میں رہا)

۱۹۶۳ع میں جب میں پیرس میں اردو ، پنجابی اور سندھی مخطوطات پر نوٹ لکھ رہا تھا[2] تو ایک ضخیم مخطوطہ پیرس کی سب سے بڑی لائبریری ببلیوتیک ناسیونال میں میری نظر سے گزرا - یہ ایک لغت تھی جو چار زبانوں یعنی لاطینی ، ہندی ، فرانسیسی اور مور (جسے اب اردو کہتے ہیں) میں لکھی گئی تھی - اس لغت کا نام 'خزینۂ

---

(۱) اس مضمون کا انگریزی متن پندرھویں آل پاکستان میوزیم کانفرنس حیدرآباد منعقدہ ۲۶ تا ۲۸ مارچ ۱۹۶۵ع میں پڑھا گیا -

(۲) میں حکومت پاکستان کی طرف سے فرانس کی سول سروس کا مطالعہ کرنے کے لیے گیا تھا ، اس لیے زیادہ تر کاوش سرکاری کام کے لیے وقف تھی - اردو مخطوطات پر میں نے جو کام کیا ، وہ میری ذاتی دل چسپی کا نتیجہ تھا -

زبان ہندوستانی' تھا اور یہ لغت سترھویں صدی میں لکھی گئی تھی ۔ یہ مخطوطہ مجھے بہت اہم معلوم ہوا اور میں نے کوشش کی کہ پتا چلاؤں کہ اس مخطوطے کا اصل مصنف کون ہے اور یہ مخطوطہ پیرس کس طرح پہنچا ۔ مخطوطہ لکھنے والے کا نام انکتیل دوبروں درج تھا ۔ چناں چہ اس کوشش میں مجھے انکتیل دوپروں کی دلچسپ زندگی کے حالات اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں اس کی تصانیف کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے اس فرانسیسی محقق میں اس لیے بھی دل چسپی ہوئی کہ وہ اردو اور فارسی کے بہت سے مخطوطات ہندوستان سے لایا تھا اور یہ مخطوطات اب ببلیوتک ناسیونال میں موجود ہیں ۔

ابراہام ہائی سنت انکتیل دوبروں ۷ دسمبر ۱۷۳۱ء کو پیرس میں پیدا ہوا[1] اس نے اوائل عمر میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور کچھ عرصہ لندن میں قیام کرنے کے بعد آکسفرڈ گیا ۔ آکسفرڈ میں اتفاقاً پارسیوں کی مذہبی کتابوں کے بارے میں چند مخطوطات زند زبان میں اس کے ہاتھ لگے ۔ انکتیل دوپروں کو ان مخطوطات میں اتنی

(۱) ملاحظہ ہو : "Voyage Aux Indes Orientaeales" مصنف — انکتیل دوپروں ، ببلیوتک ناسیونال پیرس ۔ کیٹلاگ نمبر O-K²104

دل‌چسپی پیدا ہوئی اور آتش شوق اس قدر بھڑکی کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مشرق اور خصوصاً ہندوستان کا سفر اختیار کرے گا ۔ اس نے ہندوستان جانے کی کوشش کی لیکن اسے حوصلہ شکنی کا سامنا ہوا ۔ آخرکار اسے ہندوستان جانے کی ایک ترکیب سوجھی ۔ وہ فرانس کے بحریہ میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا ۔ بحریہ میں شامل ہونے کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنے افسران سے خواہش کی کہ وہ مشرق کا سفر اختیار کرنا چاہتا ہے ۔ کچھ تگ و دو کے بعد آخر کار وہ اپنے جہاز کے کپتان کی ہم دردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ۔ جہاز کا کپتان اس کے علم کے شوق اور مشرق کے ساتھ اس کی اس قدر والہانہ محبت سے بہت متاثر ہوا اور اس نے آخر کار انکتیل دوپروں کے لیے ہندوستان جانے کا مفت انتظام کر دیا ۔ نو ماہ کے طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد انکتیل دوپروں آخرکار پانڈی چری پہنچا ۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد وہ چندرنگر گیا اور اس نے سنسکرت زبان سیکھی ۔ واپسی میں وہ پھر پانڈی چری آیا اور زیادہ تر سفر پیدل طے کیا ، اور راستے میں ہندوؤں کے تاریخی مقامات اور مندر وغیرہ دیکھے اور تاریخی معلومات حاصل کیں ۔ اس نے کچھ عرصہ سورت میں قیام کیا اور پھر ماہی گیا اور پھر واپس سورت آیا ۔ ان سفروں کے دوران میں اس نے زند

اور پہلوی زبانیں سیکھیں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابیں بھی پڑھیں۔ انکتیل دو پرون آٹھ سال ہندوستان میں رہا اور اس عرصے میں اس نے جنوبی ہندوستان ، بنگال اور وسط ہندوستان کا دورہ کیا اور اٹھارھویں صدی کے اوائل اور وسط کے ہندوستان کی تاریخ ، مذہب ، ثقافت اور سیاسیات کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ۱۷۶۲ع میں وہ واپس پیرس پہنچا اور اپنے ساتھ ایک سو اسی مخطوطات اور نوادرات کا ایک بیش بہا خزانہ پیرس لے گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے زند زبان کے مخطوطات اور تراجم کے لیے انگریزوں کی طرف سے پانچ ہزار پونڈ کی پیشکش ہوئی لیکن اس نے یہ پیش کش قبول نہیں کی۔ پیرس پہنچ کر اس نے ہندوستان کے متعلق کئی کتابیں لکھیں اور اسے شہنشاہ فرانس کا مشرقی زبانوں کا مترجم مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے فرانس کی اکادمی کا رکن منتخب کیا گیا۔ انکتیل دوپرون کا ۱۸۰۵ع میں انتقال ہوا۔

اپنی کتاب "ہندوستان پر تاریخی اور جغرافیائی تحقیق"
(Recherches Historiques et Geographique sur l'Inde)
میں انکتیل دوپرون ہندوستان کی زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سنسکرت ایک اہم زبان ہے لیکن یہ

زبان اب مر چکی ہے[1] ۔

جو زبان بہت زیادہ کار آمد اور انکتیل دوپروں کے ہندوستان چھوڑنے تک کے زمانے میں بہت زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی ، وہ فارسی تھی ۔ یہ زبان ہندوستان کے مشرق میں جزائر مالدیپ میں بھی بولی جاتی تھی ۔

لیکن انکتیل دوپروں کے خیال میں ہندوستانی ہی وہ زبان تھی جو شمالی ہند سے لے کر خلیج بنگال تک اور کھمبایت اور پورے جنوبی ہندوستان میں بولی جاتی تھی ۔ اس زبان کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ یورپ کے لوگ اسے "مور" کہتے ہیں ۔ یہ ناگری اور فارسی دونوں خطوں میں لکھی جاتی ہے ۔ فارسی رسم الخط میں لکھتے

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو : "Recherches Historiques et Geographique Sru l' Inde" ببلیوتک ناسیونال پیرس کیٹلاگ نمبر (O² K 272) صفحہ نمبر ۱۰ ۔ اسی کتاب کا ایک نسخہ کیٹلاگ نمبر O² K 1136 بھی موجود ہے ۔ یہ نسخہ شاہی محل Fontainbluc کے کتب خانے سے حاصل کیا گیا تھا ۔ اس نسخے میں کچھ صفحات غائب ہیں ۔ ان میں وہ حصہ بھی ہے جس میں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں لکھا گیا ہے ۔ لہذا محققین کیٹلاگ نمبر O²K 272 ملاحظہ فرمائیں ۔

وقت اس کے حروف تہجی میں اور کچھ نقطوں کا اضافہ
کر دیا جاتا ہے تاکہ اس میں وہ آوازیں ظاہر کی جا سکیں
جو فارسی میں موجود نہیں ہیں۔ ہندوستانی زبان میں
عرب ، ایرانی اور تاتاری ، بنگالی اور مرہٹوں کی زبانوں کی
تمام آوازوں کا اظہار ہو سکتا ہے۔ شمالی ہند اور ہمالیہ کے
سرحدی علاقے میں بولی جانے والی زبانوں کے بارے میں
انکتیل دوپروں کا کہنا ہے کہ ان علاقوں میں تبتی ،
ہندوستانی اور فارسی زبان بولی جاتی ہے۔ بہار اور بنگال میں
ہندوستانی کے علاوہ بنگالی اور فارسی بولی جاتی ہے۔

اس کے بعد انکتیل دوپروں اُن بولیوں کا کسی قدر
تفصیل سے ذکر کرتا ہے جو جنوبی ہندوستان میں
بولی جاتی تھیں۔ اس نے ان علاقوں کی کافی حد تک
صحت کے ساتھ تخصیص کی ہے جہاں یہ زبانیں بولی
جاتی تھیں ، اور بعض اوقات ان علاقوں کا طول البلد اور
عرض البلد بھی بیان کر دیا ہے جہاں وہ بولی جاتی تھیں۔
اس کے علاوہ اس نے مختلف پیشوں اور سوسائٹی کے
مختلف طبقوں میں بولی جانے والی بولیوں کا بھی ذکر کیا
ہے۔ گجرات اور احمد آباد اور ٹھٹہ (سندھ) کے بارے میں
انکتیل دوپروں لکھتا ہے کہ ان علاقوں میں فارسی، مرہٹی
اور ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے۔ اور یہ ذکر کرتے
ہوئے لکھتا ہے کہ ان زبانوں کو اس علاقے سے "بنیوں"

سے تبدیل کر لیا ہے اور وہ ان کے لیے ناگری رسم الخط استعمال کرتے ہیں۔

ہندوستان کی زیادہ اہم زبانوں اور بولیوں کا ذکر کرنے کے بعد انکتیل دوپیرون کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص ہندوستان کے ہر علاقے کے عوام سے گہرا رابطہ رکھنا چاہے تو اسے نو زبانیں جاننا ہوں گی جن میں سے ہر ایک کا رسم الخط علیحدہ ہے ۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے : " تجارت (جو ہندوستان میں یورپ کے لوگوں کا پہلا مقصد ہے) اور سیاسیات کے فروغ اور کامیابی کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ یورپ کے لوگ عوام سے گہرا رابطہ رکھیں اور وہ زبانیں سیکھیں جو ان علاقوں میں بولی جاتی ہیں[1]۔"

انکتیل دوپیرون نے اپنی کتاب "مشرق ہندوستان کا سفر" (Voyage aux Indes Orientales) (جو تین جلدوں میں ہے) میں سب سے پہلے شمالی ہندوستان اور اس کے صوبوں کا ایک نقشہ پیش کیا ہے ۔ اس نقشے کی تقسیم میں حسب ذیل علاقے شامل ہیں : سندھ ، اجمیر ملتان ،

---

(۱) ملاحظہ ہو :
"Recherches Historiques et Geographique sur l'Inde,,
صفحہ ۱۰ پیراگراف ۲ ۔

لاہور، دہلی ، آگرہ ، اودھ ، بنگال ، بہار ، بھوٹان ، نیپال اور تبت ۔ اس نقشے میں انکتیل دوپروں نے دیبل ، (سندھ) کا مشہور اور اہم شہر بھی دکھایا ہے جو مسلمانوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے فتح کیا تھا ۔ انکتیل دوپروں کے نقشے میں اس شہر کا طول البلد °44 اور عرض البلد °25 ہے ۔

اسی کتاب میں انکتیل دوپروں ہندوستان کے مختلف حصوں کے انتظام مملکت اور سماجی زندگی کے بارے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے ۔ وہ ہندوؤں کی ذات پات ، رسم و رواج اور زبانوں کا ذکر کرتا ہے اور انتظام مملکت میں وزارت اور عدالت کے عہدوں کے بارے میں تفصیلات بیان کرتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ وہ موسیقی ، شاعری ، ادویہ اور جڑی بوٹیوں تک کا تفصیل سے ذکر کرتا ہے ۔ زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے انکتیل دوپروں نے سنسکرت کے بعض الفاظ کا فارسی زبان سے مقابلہ کیا ہے ۔ اس نے "آئین اکبری" پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اپنی تحقیق میں بعض اہم سیاسی دستاویزات کا ذکر کیا ہے ۔ مثلاً آن عہدناموں میں سے اقتباسات پیش کیے ہیں جو شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی نے کیے تھے ۔

اپنی کتاب "L' Inde en Rapport Avec l' Europe" میں انکتیل دوپروں نے بہت سی تجویزیں پیش کی ہیں ۔

اس نے اس بات پر زور دیا ہے کہ باہر سے جو لوگ ہندوستان میں تجارت کے لیے آتے ہیں انھیں ملک کی زبانوں اور رسم و رواج سے واقفیت ہونی چاہیے - اس ضمن میں انکتیل دوپروں نے ایک دفتر کے قیام کی تجویز پیش کی ہے کہ جس کے سپرد یہ کام کیا جائے کہ وہ ہندوستان میں آنے والوں کو ان مسائل سے آگاہ کرے جن سے وہ یہاں دوچار ہوں گے ، اور ان زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرے جو یہاں بولی جاتی ہیں - ہندوستان کی زبانیں سیکھنے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے انکتیل دوپروں نے تجویز پیش کی کہ صرف ایسے نوجوانوں کو ہندوستان بھیجا جائے جنھوں نے زمانۂ طالب علمی میں زبانیں سیکھنے کے لیے خاص رجحان ظاہر کیا ہو - بیس پچیس سال کی عمر تک ان نوجوانوں کو قدیم تاریخ ، مشرقی تاریخ اور عبرانی، عربی، انگریزی اور جرمن زبانوں کی تعلیم دی جائے - ہندوستانی زبانوں کی تعلیم ہندوستان ہی میں ہونی چاہیے تا کہ وہ ہندوستان کی زبانوں کا صحیح تلفظ سیکھ سکیں -

انکتیل دوپروں نے ان مترجمین کو ہندوستانی زبانوں کی تربیت دینے کے لیے ایک مفصل سکیم پیش کی ہے - اس نے ہر علاقے کے لیے مترجمین کی اس تعداد کی بھی صراحت کر دی ہے جو اس کے خیال میں سکیم کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری تھی - انکتیل دوپروں کی

راۓ میں مختلف علاقوں کی زبانوں کی تعلیم کے لیے مترجمین کی تعداد حسب ذیل ہونی چاہیے :

بنگال ، بہار ، اودھ

فارسی ، مور (موجودہ اردو) بنگالی اور تبتی زبانوں کے لیے ـــــــ چار مترجمین ۔

مسولی پٹم

فارسی ، مور (موجودہ اردو) اور تلنگی زبانوں کے لیے ـــــــ دو مترجمین ۔

پانڈی چری

فارسی ، مور (موجودہ اردو) اور مالاباری زبانوں کے لیے ـــــــ دو مترجمین ۔

ٹراونکور (ٹیپو سلطان) اور ماھی ۔

تامل اور فارسی زبانوں کے لیے ـــــــ چار مترجمین ۔

بسین

(مرہٹوں کے لیے) مرہٹی ، فارسی اور مور (موجودہ اردو) زبانوں کے لیے ـــــــ دو مترجمین ۔

سورت

فارسی ، مور (موجودہ اردو) مرہٹی وغیرہ کے لیے ـــــــ دو مترجمین ۔

ٹھٹہ (سندھ)

فارسی ، مور (موجودہ اردو) وغیرہ کے لیے —— —— دو مترجمین

مندرجہ بالا تجویز سے اٹھارھویں صدی کے ہندوستان میں ملک کی لسانی تقسیم اور مختلف زبانوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

انکتیل دوپروں کی رائے میں یہ دفتر قائم کرنے سے تین بڑے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں : اول تجارت ، دوئم ہندوستان کی مختلف طاقتوں سے گفت و شنید ، اور سوئم انتظامیہ ۔ یورپین مترجمین کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے انکتیل دوپروں لکھتا ہے کہ : "بد قسمت سراج الدولہ نواب بنگالہ نے ۱۷۵۷ء میں خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اسے ایک ایسے فرانسیسی کی ضرورت ہے جو فارسی جانتا ہو ۔" اسی قسم کی درخواست نواب سورت نے بھی انکتیل دوپروں سے کی تھی ۔

اسی کتاب میں انکتیل دوپروں نے دربار مغلیہ کے سرکاری جریدوں اور دیگر اہم سرکاری دستاویزات سے بہت سے اقتباسات نقل کیے ہیں ۔ اس نے انتظامیہ ، عدلیہ ، پولیس ، خزانہ ، وغیرہ کے محکموں کے افسروں کے فرائض خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں اور فوج کے مختلف عہدیداروں کا بھی ذکر کیا ہے ۔

ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کے کام میں دشواریوں کے بارے میں انکتیل دوپروں نے کہا ہے کہ یہ دشواریاں بالکل فطری ہیں، اور جو لوگ عیسائی مشنریوں کے کام سے خاطر خواہ مطمئن نہیں ، ان سے سوال کرتا ہے کہ: "کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک مسلمان یا ایک برہمن پیرس کے مجمع میں کھڑا ہوکر قرآن یا وید کی آزادانہ تبلیغ کرے؟" (صفحہ ۲۶۳)

قرآن کے بارے میں انکتیل دوپروں لکھتا ہے کہ: "مسلمانوں کی نظر میں یہ کتاب ضابطۂ دیوانی اور ضابطۂ فوجداری دونوں حیثیتوں کی حامل ہے۔" وہ لکھتا ہے کہ قرآن ایمان نہ لانے والوں کے ساتھ بھی کافی فیاضانہ سلوک کیے جانے کا مشورہ دیتا ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان نہ لائیں ان کے ساتھ بھی خوش معاملگی سے پیش آنا چاہیے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۰۰ پر انکتیل دوپروں نے سورہ توبہ کی پانچویں آیت کا عربی متن اور فرانسیسی ترجمہ پیش کیا ہے:

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

(لیکن یہ معاہدے ان مشرکین سے ختم نہیں ہو جاتے جنھوں نے تم سے اشتراک عمل کیا تھا اور بعد میں مصیبت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑا اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کی مدد کی۔ تم اپنے معاہدوں پر آخر تک عمل کرو۔ خدا نیک انسانوں سے محبت کرتا ہے۔)

اس کے بعد سورہ توبہ کی آٹھویں آیت سے اقتباس کا عربی متن اور فرانسیسی ترجمہ پیش کیا ہے :

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖ اِلاَّ الَّذِيْنَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۚ اِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○

(مشرکین کے ساتھ خدا اور رسول کی مرضی سے معاہدہ کیسے ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ ان مشرکین سے جنھوں نے تمہارے ساتھ مسجد کے قریب معاہدہ کیا ہو۔ جب تک یہ لوگ تم سے راست باز رہیں، تم بھی ان سے راست باز رہو۔ خدا نیک انسانوں سے محبت کرتا ہے۔)

انکتیل دوپروں کی اہم ترین تصانیف میں اپنشد کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی ہے۔ یہ ترجمہ انکتیل دو پروں نے اپنشد کے ایک فارسی زبان کے مخطوطے

سے کیا تھا ۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ، انکتیل دوپروں اپنے ساتھ بہت سے مخطوطات پیرس لے گیا ۔ یہ مخطوطات اب ببلیوتک ناسیونال پیرس میں موجود ہیں ۔ بعض دیگر مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے دوپروں کہتا ہے کہ یہ مخطوطات سلطنت مغلیہ اور خصوصاً ۱۷۰۷ع سے ۱۷۶۰ع تک کے زمانے کے بارے میں بہت سی اہم معلومات کا خزانہ ہیں ۔ ان مخطوطات میں اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ ، عہد عتیق سے لے کر شاہ عالم ثانی کے عہد تک کی مختصر تاریخ اور خافی خاں کی اس تاریخ کا مخطوطہ بھی موجود ہے جس میں امیر تیمور اور اس کے بعد کی تاریخ بیان کی گئی ہے ۔

اس مضمون کے شروع میں میں نے ایک لغت کا ذکر کیا تھا جو چار زبانوں یعنی لاطینی ، مور (موجودہ اردو) فرانسیسی اور ہندی زبانوں میں ببلیوتک ناسیونال میں موجود ہے اور جس کا مخطوطہ انکتیل دوپروں نے نقل کیا تھا ۔ اس لغت کے مخطوطے پر انکتیل دوپروں نے جو نوٹ فرانسیسی زبان میں قلم بند کیا ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

> "۱۷۵۸ع میں جب میں سورت میں تھا اور زند اور پہلوی کتابوں کا ترجمہ کر رہا تھا تو مقامی پارسی عالموں سے بات چیت کرنے

کے لیے جدید فارسی زبان استعمال کرتا تھا۔
لیکن روزمرہ کی گفتگو کے لیے اور سورت
اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں مثلاً
کارومنڈل ، مالا بار ، بنگال وغیرہ میں
سیر و سیاحت کے لیے مور Maure یا ہندوستانی
زبان بولنا پڑتی تھی۔
"میں نے سورت میں ایک کاپوچین مشنری کے
یہاں ایک پرانا لیکن نہایت بیش قیمت مخطوطہ
دیکھا ۔ یہ ایک (مور ۔ فرانسیسی) لغت تھی۔
میرا ارادہ تھا کہ اس کی نقل کر لوں لیکن
میری علالت ، مصروفیات اور سورت میں
بعض دیگر پریشانیوں کی وجہ سے میں یہ کام
نہ کر سکا ۔ اس کے بعد مجھے سخت افسوس
رہا کہ میں نے اس بیش قیمت لغت کی نقل
نہ کی ۔ آخر سنہ ۱۷۷۸ع میں میں نے ایک*
کتاب "Alphabetum Brahmanicum" دیکھی
جو ۱۷۷۱ع میں روم سے شائع ہوئی تھی ۔
اس کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ
روم کے صیغۂ تبلیغ و اشاعت کے کتب خانے
میں ہندوستانی زبان کی لغت کا ایک نسخہ
موجود ہے جو سورت میں ایک مشنری نے

لکھا تھا ۔ اس نسخے کے بارے میں جو
تفصیل تحریر کی گئی تھی ، اس سے مجھے
شبہ ہوا کہ غالباً یہ وہی مخطوطہ یا اس کی
نقل تھی جو میں نے سورت میں دیکھا تھا ۔
لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ قیمتی
مخطوطہ کبھی مجھے دوبارہ بھی مل سکے گا ۔
خداوند قدیر و قدر نہ صرف اپنے برگزیدہ
بندوں کے مقسوم سے واقف ہے بلکہ اس کم
مایہ مخلوق سے بھی واقف ہے جسے اس نے
خلق کیا ۔ کلیسا کے سربراہ بھی اپنے کلیساؤں
کے ارکان کے دلی مدعا سے واقف ہیں ۔ چنانچہ
پاپائے اعظم نے حکم دیا کہ چوں کہ میں
ایک ایسی لغت عوام کے سامنے پیش کرنا
چاہتا ہوں جو ہندوستان میں مشنریوں کے لیے
کارآمد ثابت ہوگی ، یعنی مور ، ہندوستانی زبان
کی لغت ، اس لیے اس لغت کا مخطوطہ مجھے
بھیج دیا جائے ۔ آخرکار میں اس پدرانہ شفقت
سے سرفراز ہوا اور ۱۴ ۔ اکتوبر ۱۷۸۳ع کو
مجھے ہندوستانی زبانوں کا وہ خزینہ مل گیا
جو کہ روم کے صیغۂ نشر و اشاعت میں
اکتوبر ۱۷۰۴ع کو داخل کیا گیا تھا ۔

"اس عنایت خسروانہ سے میری ہمت افزائی ہوئی
اور میری رگوں میں ایک بار پھر اسی نوجوان
کا خون دوڑنے لگا جو کسی زمانے میں
حوصلہ بھی تھا اور سنجیدہ بھی، اور جس نے
گھاٹوں کا سفر کیا تھا، باد و باراں اور طوفانوں
کی مصیبتیں برداشت کی تھیں اور تمام مشکلات
کا سامنا کر کے تین مردہ زبانیں زند، پہلوی
اور سنسکرت سیکھی تھیں -

"میں نے 'Thesaurus Linguae Indianae' کے
مخطوطے کو پورے کا پورا نقل کر لیا ہے اور
ایک نقطہ بھی نظر انداز نہیں کیا - میں نے
نقل کا اصل سے تین مرتبہ مقابلہ کیا - یہ کہ
ایک مور، فارسی، فرانسیسی، لاطینی لغت
کی بنیاد ہوگی جو میں تیار کرنا چاہتا ہوں -"

اس کے بعد انکتیل دوپروں نے بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے کس طرح چند اضافے مخطوطے میں کیے ہیں - اس نے قوسین میں چند الفاظ کا اضافہ لاطینی رسم الخط میں کیا ہے - اس نے چند ایسے الفاظ بھی لکھے ہیں جو اس کی رائے میں صحیح طور پر ترجمہ نہیں کیے گیے تھے اور کہیں کہیں ادھر ادھر تھوڑی سی ترمیم کی ہے - انکتیل دوپروں اپنے نوٹ کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے :

"جناب پاپائے روم کا یہ فیصلہ کہ یہ مخطوطہ میرے پاس پیرس میں بھیج دیا جائے ، یورپ کے لیے ایک مثال اس امر کی ہے کہ تمام اہل علم ایک خاندان کی طرح ہیں ۔ میں استدعا کرتا ہوں کہ موصوف اس لطف و کرم کے لیے میرا سپاس عقیدت قبول فرمائیں ۔

پیرس - ۱۰ مارچ سنہ ۱۷۸۴ع - انکتیل دوپرون (Anquetil Duperron) ، سیاح - رکن اکادمی ادبیات عالیہ و مترجم شاہی برائے السنہ مشرقیہ ۔"

انکتیل دوپرون نے یہ نوٹ انقلاب فرانس سے پانچ سال پہلے لکھا ۔ غالباً وہ اردو ، فرانسیسی لغت لکھنے کے ارادے کو انقلاب فرانس کے ہنگاموں کی وجہ سے عملی جامہ نہ پہنا سکا ۔ بہرحال یہ مخطوطہ ایک فرانسیسی ، اردو لغت کی بہت اچھی بنیاد ہو سکتا ہے ۔ کاش پاکستان کے متعلقہ ارباب حل و عقد اس "خزینہ" کی طرف توجہ کریں اور کم از کم اس مخطوطے کو مناسب طور پر ایڈٹ کرنے کا انتظام ہی کر دیا جائے ۔

اس مضمون میں میں نے الکتیل دوپرون کی شخصیت اور تصانیف کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کی ہے ۔ اس دانش‌ور اور مورخ کی تصنیفات بہت دل‌چسپ اور معلومات افزا ہیں ۔ لیکن پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ

کی کتابوں میں انکنبل دوپروں کا ذکر تفصیل سے شاید ہی کہیں ملے ۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد سے لےکر ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے استحکام تک کی تاریخ خاصی پیچیدہ ہے ۔ ہندوستان کے اس دور کی تاریخ زیادہ‌تر برطانوی مورخین کی لکھی ہوئی ہے اور کم و بیش برطانوی سیاحوں وغیرہ کے ملفوظات پر مبنی ہے ۔ برطانوی مورخین کے تبحر علمی کو اس برصغیر میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ہمارے مورخین برطانوی مورخین کی علمی کاوشوں کے لیے ان کے ممنون ہیں ۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر اس دور میں ان مورخین نے اس دور کی تاریخ پر قلم نہ اٹھایا ہوتا تو شاید اس موضوع پر ہمیں بہت کم مواد حاصل ہوتا ۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہندوستان کے اس دور کی تاریخ کے بارے میں دوسرے ملکوں کے محققین کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کیا جائے ۔ خصوصاً اس لیے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسیات میں ایک سے زیادہ بیرونی طاقتیں کارفرما تھیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور کی تاریخ کے مطالعے پر قرار واقعی توجہ کی ضرورت ہے اور اس مطالعے میں ان فرانسیسی محققین کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کرنا بھی‌ضروری ہے جو اس زمانے میں ہندوستان آئے ۔ اس‌مطالعے سے اس برصغیر کی تاریخ کے ایک نئے پہلو پر روشنی پڑے گی ۔

وکٹر اِوگو کی محبوبہ کے خطوط

وکٹر اِوگو کے نام[1] سے قارئین اچھی طرح واقف ہیں۔

---

(۱) Victor Hugo (وکٹر اوگو) کو اردو میں عموماً 'وکٹر ہیوگو' لکھا جاتا ہے۔ یہ تلفظ انگریزی تلفظ کی نقل ہے جو صحیح نہیں۔ T کا تلفظ فرانسیسی زبان میں ہمیشہ 'ت' ہوتا ہے 'ٹ' کبھی نہیں ہوتا۔ اور H کی آواز الف کی ہوتی ہے 'ہ' کی نہیں ہوتی۔ فرانسیسی زبان میں U کی آواز ایک خاص قسم کی ہوتی ہے جو جرمن زبان میں تو ہے لیکن انگریزی، اطالوی، ہسپانوی اور دیگر لاطینی زبانوں میں نہیں ہے۔ فرانسیسی زبان میں U کی آواز نکالنے کی آسان صورت یہ ہے کہ ہونٹوں کو گول بنا کر (بوسہ لینے کے انداز میں) 'ای' کی آواز نکالی جائے۔ اس طرح جو آواز نکلے گی اس کے لیے 'اِو' سے بہتر کوئی اور صورت نظر نہیں آتی۔ پیرس میں ڈاکٹر حمیداللہ فرانسیسی زبان کو اردو رسم‌الخط میں لکھنے کے موضوع پر کام کر رہے ہیں؛ ان سے جب میری گفتگو ہوئی تو انھوں نے 'U' کے لیے 'اِو' کو بہتر سمجھا۔ اس طرح Victor Hugo کا صحیح تلفظ 'وکٹر اِوگو' ہے نہ کہ 'وکٹر ہیوگو'۔

کیوں کہ اس کے چند مشہور ناولوں کا انگریزی میں ترجمہ ہوچکا ہے ۔ اوگو کے ناول 'لے مزغابل' (مصیبت زدہ) کا شمار دنیا کے بہترین ناولوں میں ہوتا ہے ۔ وکٹر اوگو ایک رنگا رنگ شخصیت کا مالک تھا ۔ اس نے صرف ناول ہی نہیں لکھے ، ڈرامے بھی لکھے ہیں اور تحقیقی مضامین بھی ؛ نظمیں بھی کہی ہیں اور افسانے بھی لکھے ہیں ۔ وہ آرٹسٹ بھی تھا اور ایک عرصے تک اس نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا ۔ سب سے زیادہ پر لطف بات یہ ہے کہ اس کا دل و دماغ مغربی انداز فکر ہی سے نہیں ، مشرق ادب اور فلسفے سے بھی متاثر تھا ۔ چناں چہ اس نے گوئٹے کے مشرق دیوان کی طرح ایک 'بیاضِ مشرق'——'لے زوغیانتال' (LES ORIENTALES) بھی لکھی ہے جس میں اس نے مشرق موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں اور اس بات پر فخر کا اظہار کیا ہے کہ یہ نظمیں لکھنے میں وہ سعدی ، حافظ ، رومی ، ابولواس ، متنبی وغیرہ سے متاثر ہوا ۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر اوگو کی شخصیت کے اس پہلو سے برصغیر میں ادب کے طالب زیادہ واقف نہیں ۔ اس کی محبوبہ ژولیت دروے کے خطوط بہت دل چسپ ہیں ۔ ذیل میں ان کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے ۔

ژولیت دروے (JULIETTE DROUET) ایک

ایکٹریس تھی ۔ وکٹر اوگو سے اس کی محبت کی ابتدا اس وقت ہوئی جب اس نے اوگو کے ڈرامے 'لکریس بورژیا' میں شہ زادی نگرونی کا پارٹ کیا ۔ اس ڈرامے میں ژولیت کا کردار بہت کامیاب رہا ۔ مصنف نے ایکٹریس کی تعریف کی اور ایکٹریس مصنف پر ہزار جان سے اس طرح فدا ہوئی کہ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے ایکٹریس کی شہرت اور عیش کی زندگی کو ترک کر دیا اور ایک معمولی سے مکان میں رہنے لگی ۔ اب اس کے سامنے ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ وہ وکٹر اوگو کے قریب رہے ۔ عرصے تک یہی صورت رہی ۔ وکٹر اوگو نے ڈرامے اور ناولیں لکھیں ۔ ژولیت اسے خط لکھتی رہی ۔ یہ خط سینکڑوں کی تعداد میں ہیں ۔ کبھی کبھی ژولیت ایک دن میں تین تین چار چار خط لکھتی ۔ ان میں سے چند خطوط پیرس کے مشہور ادبی رسالے 'ریوو دے دو موند' (Revue des deux Mondes) یعنی 'دو عالم کا مجلہ' کی جلد نمبر ۶۵ بابت ۱۹۲۸ع میں شائع ہوئے تھے ۔ ان میں سے پہلے دو خطوط کے اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں ۔

یہ ۱۸۳۸ع ہے ۔ ژولیت اور وکٹر اوگو کے معاشقے کو شروع ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں ۔ ان کی محبت طوفانی دور ختم کر چکی ہے ۔ ژولیت کی عمر بتیس سال ہے ۔ وہ عرصہ ہوا تھیٹر کی پرتعیش زندگی چھوڑ

دکی ہے ۔ اور پیرس کے ایک محلے سینٹ انساس میں ایک معمولی سے مکان میں رہتی ہے ۔ وکٹر اوگو کئی ڈرامے لکھ چکا ہے ۔ اسے پیرس کے ایک بڑے تھیٹر کا ڈائریکٹر دعوت دیتا ہے کہ وہ اسپین کے پس منظر میں ایک ڈراما لکھے ۔ وکٹر اوگو کو اسپین اور اس کی تاریخ سے بہت دلچسپی تھی (خصوصاً اسپین میں مسلمانوں کے ثقافتی اثرات سے) وکٹر اوگو نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور طے کر لیا کہ وہ یہ ڈراما لکھے گا اور یہ ڈراما اس کا شاہکار ہوگا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا ۔ وکٹر اوگو کا یہ ڈراما 'روئی بلا' (Ruy Blas) اس کا سب سے اچھا ڈراما سمجھا جاتا ہے ۔ یہ ڈراما لکھنے کے لیے وکٹر اوگو نے بہت محنت کی ۔ اور صرف اسپین کی تاریخ پر فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں میں چودہ کتابیں لائبریری سے حاصل کیں ۔ ژولیت جانتی تھی کہ اب وکٹر اوگو پھر مصروف ہو جائے گا اور اس سے عرصے تک نہیں ملے گا ۔

جس روز اوگو نے یہ ڈراما لکھنے کا فیصلہ کیا اسی دن ۱۶ جون ۱۸۳۸ع کو ۱۱ بجے صبح ژولیت نے وکٹر اوگو کو خط میں لکھا :

"کیا آج سے میری تنہائی کا زمانہ شروع ہو گیا ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے ایک قید تنہائی اس امید پر گزارنی پڑے گی کہ ایک

دن تم مجھ سے آن ملو گے۔"

اسی روز رات کو ساڑھے آٹھ بجے ژولیت نے دوسرا خط لکھا :

"ایک یا دو ماہ تک تمھیں نہ دیکھنے کا تصور میرے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں سنجاب کے ٹکڑے پر گرنے والے قطروں کی طرح جذب ہو کر رہ جاؤں گی۔ اپنے جذبات کو تم سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہوں پھر بھی دل نہیں مانتا کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ جب تم کسی کام میں مصروف ہوجاتے ہو تو تمھاری توجہ میری طرف سے ہٹ جاتی ہے۔"

اکیس جون کو وکتر اوگو نے ڈراما لکھنا شروع کر دیا۔ اسی روز رات کے ساڑھے سات بجے ژولیت نے وکتر اوگو کو لکھا :

"پیارے! کیا تم نے آج سے اپنا کام باقاعدہ شروع کر دیا؟ میں اس پر ساری دنیا کو مبارک باد دیتی ہوں سوائے اپنے آپ کے۔ مجھے تمھارے شاہکاروں کے مقابلے میں تمھاری محبت کا ایک لمحہ .... زیادہ پسند ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں احمق

ہوں یا تمھاری عظیم شاعری کی طرف توجہ نہیں دیتی ، بلکہ یہ کہ تمھارے ایک .... میں میں تمھاری تخلیقی قوت اور تمھاری روح کو محسوس کر سکتی ہوں۔

"میں نہیں جانتی کہ میں ان ایام غم کو کیسے برداشت کروں گی جو آج سے شروع ہو رہے ہیں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ میں یہ صبر ازما وقت کاٹنے کے لیے اپنی تمام ہمتیں صرف کر دوں گی۔

"میں تمھیں کتنا یاد کرتی ہوں ! کتنا چاہتی ہوں ! (کاش میں اس کا اظہار کر سکتی) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے دل سے تمھاری ہر آواز سن سکتی ہوں۔ تم مجھ پر انتہائی ظلم کرو گے اگر تم (کم از کم) مجھے وہ سب کچھ نہ دے دو جس کا تعلق تمھاری (علمی و ادبی) آرزوؤں سے نہیں ہے۔ (یعنی میں تمھاری وہ تمام توجہ چاہتی ہوں جو تمھاری علمی مصروفیتوں سے باقی بچ رہے)۔ میرے پیارے! میرے وکٹر! میں آج مر جانا چاہتی ہوں تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ میں تمھیں کتنا چاہتی ہوں کیوں کہ جب تک

میں زندہ ہوں تم یہ کبھی نہ جان سکو گے ۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ میری محبت اور تمھاری
روح کے درمیان کچھ ایسی رکاوٹیں حائل ہیں
جو تمھیں میری محبت کی گہرائیوں تک پہنچنے
نہیں دیتیں ۔"

رالف رسل

اردو زبان و ادب کا ایک انگریز شیدائی

انگریزوں نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اس سے اہل نظر خوب واقف ہیں ۔ ہندوستان پر برطانوی تسلط کے بعد ایک عرصے تک انگریزوں نے اردو کی حوصلہ افزائی کی ۔ اس مختصر دور میں جتنا بنیادی کام اردو میں ہوا ، اتنا غالباً اس کے بعد کبھی نہیں ہوا ۔ یہ ایک حقیقت ہے، تلخ سہی لیکن حقیقت یہی ہے ۔ اور جب انگریز حاکموں نے اردو زبان کی طرف سے بے اعتنائی برتنا شروع کی تو آہستہ آہستہ اردو بولنے والوں نے بھی اپنی زبان کو نظروں سے گرا دیا ۔ چند بڑے شاعر اور ادیب ضرور پیدا ہوئے لیکن اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے نقطۂ نظر سے انگریزوں نے جو کام اپنے ابتدائی دور میں شروع کیا تھا اگر ہم اسے (انگریزوں کی "سرپرستی" سے محروم ہونے کے بعد) جاری رکھتے تو اردو زبان آج سے پچاس سال قبل اس منزل پر پہنچ چکی تھی جس کی ہم اب

تمنا کر رہے ہیں۔

اس عرصے میں اردو کو کچھ انگریز چاہنے والے بھی ملے۔ گلکرسٹ سے لے کر گراہم بیلی تک کئی انگریز اہل علم نے اردو زبان میں دلچسپی لی اور یورپ کے مستشرقین کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ یہاں ایک اور تلخ حقیقت کی طرف بھی توجہ مبذول کرا دوں، دوسری عالمی جنگ سے قبل ہندوستان میں اردو زبان ایک مضمون کی حیثیت سے میٹرک کے بعد بہت کم یونیورسٹیوں میں تسلیم کی جاتی تھی۔ اور اردو میں ایم۔ اے کی کلاسیں تو بہت بعد میں شروع ہوئیں۔ جس عہد میں اردو کی حیثیت اپنے وطن میں یہ تھی، اس زمانے میں لندن یونیورسٹی میں اردو زبان میں پی ایچ۔ ڈی کے درجے تک کام ہو رہا تھا۔ چناں چہ ہمارے کئی اہل قلم مشاہیر مثلاً ڈاکٹر زور، ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ وغیرہ نے اسی دور میں لندن یونیورسٹی میں نہایت قابل اساتذہ کے زیر نگرانی اعلیٰ تحقیقی کام کیا اور ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ اس لیے غالباً یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تحقیقی کام کی روایت قائم کرنے میں لندن یونیورسٹی کا بڑا حصہ ہے۔

لندن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو عرصے سے قائم ہے۔ اس میں آنرز اور پی ایچ۔ ڈی کے درجے تک

تعلیم کا انتظام ہے ۔ اس شعبے میں ایک استاد اہل زبان (پاکستانی یا ہندوستانی) تین تین سال کے لیے مقرر کیا جاتا ہے اور دوسرا استاد انگریز مستقل عہدہ دار ہوتا ہے ۔ انگریز استاد کے عہدے پر رالف رسل صاحب ۱۹۴۹ء سے فائز ہیں ۔ میرے قیام لندن کے دوران رسل صاحب لیکچرر تھے ، اب وہ ریڈر ہیں ۔ لندن میں میری ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں اور بعض اوقات خاصی طویل ۔ رسل صاحب نہایت رنگا رنگ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں ۔ وہ اردو اس بے تکلفی سے بولتے ہیں جس طرح ہم ۔ بلکہ وہ ہماری طرح اردو نہیں بولتے کیونکہ ہم اردو بولتے وقت عموماً ایک تہائی الفاظ اور بعض اوقات جملے کے جملے انگریزی کے بول جاتے ہیں۔ لیکن رالف رسل صاحب جب اردو بولتے ہیں تو اردو ہی بولتے ہیں ۔

رالف رسل اردو ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ انھوں نے اردو زبان کی صوتیات ، تنقید ، عروض ، قواعد ، وغیرہ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے ۔ جن مسائل میں رائے کی گنجائش ہوتی ہے ، ان میں رسل صاحب اپنی جچی تلی رائے رکھتے ہیں ۔ اور جن مسائل میں رائے کی گنجائش نہیں ہوتی یا انھوں نے غور کرکے کوئی رائے قائم نہیں کی ہوتی ان میں خواہ مخواہ اپنی رائے مسلط نہیں کرتے ۔ اور نہ غیر مفید مباحث ہی میں الجھتے ہیں ۔

اردو زبان بولنے والوں کی تہذیب و تمدن (اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں سمیت) سے رسل صاحب اچھی طرح واقف ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہمارے رسم و رواج کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے خاندان کی کوئی بڑی بوڑھی عورت بات کر رہی ہو۔

رسل صاحب سے میں نے چند مخصوص جملے اور 'اصطلاحات' ایسی بھی سنیں جو صرف علی گڑھ میں رائج ہیں۔ (معلوم نہیں اب بھی ہیں یا نہیں) حتیٰ کہ رسل صاحب کو بعض شعرا کا مخصوص 'غیر مطبوعہ' کلام بھی یاد ہے۔

رسل صاحب عرصے سے تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ ان کے مضامین اور تراجم مؤقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے عزیز احمد کے ناول 'ایسی بلندی ایسی پستی' کا ترجمہ بھی کیا ہے جس کی اشاعت کا انتظام یونیسکو کی طرف سے کیا جا رہا ہے۔ رسل صاحب نے ''تین مغل شعرا'' : میر، سودا اور میر حسن نیز ان کے عہد پر جو کام کیا ہے، وہ زیر اشاعت ہے۔ اس کام میں جزوی طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے ذہین اور جوان سال استاد ڈاکٹر خورشید الاسلام رسل صاحب کے شریک کار تھے۔ ۱۹۶۵ء کے آخر میں انھوں نے اٹھارھویں صدی کی اردو شاعری پر ایک کتاب مکمل کرکے ناشر کو دے دی ہے۔

آج کل رسل صاحب غالب کی شاعری اور خطوط کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر اہم تحقیقی کام بھی کر رہے - یہ کام انھیں یونیسکو کی طرف سے دیا گیا ہے - حال ہی میں رسل صاحب کی زیر نگرانی ایک طالب علم نے "رتن ناتھ سرشار" پر کام کرکے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے -

ایک اور اہم موضوع جس پر رسل صاحب کام کر رہے ہیں 'مرثیہ' ہے - یہ کام انھوں نے ۱۹۵۸ع میں شروع کیا تھا جب وہ تعلیمی رخصت پر برصغیر پاک و ہند آئے تھے - ڈاکٹر خورشید الاسلام نے بھی اس کام میں رسل صاحب کی مدد کی - رسل صاحب نے اردو زبان کے مشہور مرثیہ نگاروں خصوصاً انیس کے کلام کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے - ایک باشعور محقق کی طرح وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مذہبی اور معاشرتی ماحول کا بھی قریب سے مطالعہ کیا جائے جس میں اس صنف ادب کی تخلیق ہوئی -

رالف رسل صاحب اردو کے سچے پرستار ہیں - اردو زبان کو پرستار ہمیشہ ملے اور ملتے رہیں گے ؛ اپنوں میں سے نہ سہی غیروں میں سے سہی - بقول شاعر :

نہ ماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نہ باشد کوہ کن است

"—وہ اسباب جن کی بنا پر میں نوبل پرائز منظور کرنے سے انکار کر رہا ہوں ، نہ تو براہ راست سویڈن کی اکادمی سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ نوبل پرائز ہی سے ؛ جیسا کہ میں نے اپنے اس خط میں مفصل طور پر بیان کر دیا ہے جو میں نے اکادمی کو لکھا تھا ۔ اس خط میں میں نے دو طرح کے وجوہ بیان کیے ہیں ۔ ایک وہ جن کا تعلق میری ذات سے ہے اور دوسرے وہ جن کی حیثیت معروضی ہے ۔

میرے ذاتی وجوہ حسبِ ذیل ہیں :

میرا نوبل پرائز لینے سے انکار کرنا کوئی نئی بات نہیں ۔ میں نے ہمیشہ سرکاری اعزازات قبول کرنے سے انکار کیا ہے ۔ جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء میں جب میرے لیے لژاں دانر (Legion d'honour) کا اعزاز تجویز کیا گیا تو میں نے انکار کیا ، حالانکہ حکومت کے افراد سے مجھے دوستی کا شرف حاصل رہا ہے ۔ اسی طرح میں نے کالژ د فرانس (College de France) میں شمولیت کی بھی کوشش نہیں کی ، حالانکہ میرے بعض احباب

نے یہ تجویز پیش کی تھی ۔"

میرا نظریہ :

میرے اس رویے کی بنیاد وہ نظریہ ہے جو میں ایک ادیب کے کام کے بارے میں رکھتا ہوں ۔ ایک اہل قلم جس کی حیثیت سیاسی ، سماجی اور ادبی ہو ، اس کو اپنے کام کے لیے وہی طریقۂ کار استعمال کرنا چاہیے جو اس کا ذاتی ہو ، یعنی اظہار بذریعۂ تحریر ۔ جب ایک اہل قلم کو اعزاز دیے جاتے ہیں تو اس کی تحریریں پڑھنے والے ایک خاص قسم کے دباؤ سے متاثر ہو جاتے ہیں ۔ یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ۔ اگر میں اپنے دستخط کرتے وقت صرف 'ژاں پال سارتر' لکھوں تو اس کی الگ حیثیت ہوگی ، اور اگر میں 'ژاں پال سارتر ، صاحب نوبل پرائز" لکھوں تو یہ اور بات ہو جائے گی ۔

ایک اہل قلم جب اس قسم کا کوئی امتیاز قبول کرتا ہے تو وہ اس انجمن یا ادارے کو بھی اپنے ساتھ الجھا لیتا ہے جس نے اسے یہ اعزاز دیا ۔ (مثلاً) وینیزویلا کی محب وطن جماعت

سے میری ہم‌دردی کا تعلق صرف میری ذات سے ہے ؛ لیکن اگر ژاں پال سارتر ، صاحبِ نوبل پرائز ، وینیزویلا کی کسی تحریک کی حمایت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نوبل پرائز اس کے ادارے کو بھی اپنے ساتھ ملوث کر لے گا ۔

اس لیے ہر اہل قلم پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک ادارے کی شکل میں تبدیل کیے جانے کی اجازت نہ دے ۔ خواہ وہ ادارہ زیر بحث ادارے کی طرح کتنا ہی باعزت کیوں نہ ہو ۔ (یعنی ایک اہل قلم کو انفرادیت قائم رکھنی چاہیے ، ادارہ نہ بن جانا چاہیے) ۔

میرا یہ نظریہ کلی طور پر ذاتی ہے اور اس سے اُن حضرات پر کسی قسم کی تنقید مقصود نہیں جنھیں اس طرح کا اعزاز اس سے پہلے دیا گیا ہے ۔ ان حضرات سے مجھے شرف نیاز حاصل ہے اور میرے دل میں ان کی بہت بڑی قدر و منزلت ہے ۔

مشرق اور مغربی ثقافت کا تصادم :

ثقافتی محاذ پر اس وقت ایک ہی جد و جہد

جاری ہے اور وہ ہے دو ثقافتوں ، یعنی مشرقی اور مغربی ثقافت کی پر امن بقائے باہمی کے لیے جد و جہد ۔ اس اظہار سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان ثقافتوں کو باہم شیر و شکر ہو جانا چاہیے ۔ میں اس امر سے بہ خوبی آگاہ ہوں کہ ان دونوں ثقافتوں کا تقابل ایک تصادم کی صورت اختیار کرسکتا ہے ۔ لیکن یہ تصادم انسانوں اور ثقافتوں کے درمیان ہی رہنا چاہیے؛ اداروں کو اس سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ ذاتی طور پر میں ان دو ثقافتوں میں شدت سے تضاد محسوس کرتا ہوں اور اس کا عادی بن چکا ہوں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری ہم‌دردیاں سوشلزم اور اس نقطۂ خیال کے ساتھ ہیں جسے مشرق بلاک کہا جاتا ہے ۔ لیکن میں ایک بورژوا گھرانے اور بورژوا ثقافت میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا ہوں ، اس وجہ سے میں ہر اس چیز سے اشتراک عمل کر سکتا ہوں جو ان دو ثقافتوں کے قریب لے جا سکتی ہے ۔ یہ سوشلزم (کا راستہ) ہے اور میں اسی کو اپنا "بہترین العام" سمجھتا ہوں ۔

ان وجوہ کی بنا پر میں کوئی اعزاز قبول نہیں کر سکتا ؛ چاہے وہ کسی مشرقی ادارے کا ہو یا مغربی ادارے کا ، خواہ میں ان اداروں کی اہمیت کا کتنا ہی معترف کیوں نہ ہوں ۔ میری تمام ہمدردیاں سوشلزم کے ساتھ ہیں لیکن اس کے باوجود اگر مجھے لینن پرائز دیا جائے تو اسے قبول کرنا بھی میرے لیے ممکن نہ ہوگا ۔ لیکن اس وقت یہ صورت حال درپیش نہیں ہے ۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ نوبل پرائز اپنی نوعیت کے لحاظ سے محض مغربی بلاک کا ادبی انعام نہیں ہے لیکن عملی طور پر صورت حال کچھ ایسی ہی ہے اور اس لیے ایسے حالات بھی پیدا ہوسکتے ہیں جب کہ اکادمی کے اراکین کو بھی فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے ۔

نوبل پرائز مشرق کے مخالفین کو دیا جاتا ہے :

ان حالات کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوبل پرائز یا تو مغرب کے اہل قلم کے لیے مختص کر دیا گیا ہے یا ان اہل قلم کو دیا جاتا ہے جنھوں نے مشرق سے

بغاوت کی ہے۔ مثلاً نرودا (Neruda) کو ابھی تک یہ اعزاز نہیں بخشا گیا حالانکہ وہ جنوبی امریکہ کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اسی طرح لوئی آراگاں پر بھی اس سلسلے میں کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا حالانکہ وہ بھی اس اعزاز کا مستحق ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ یہ انعام پاسترنک کو دے دیا گیا لیکن شولوخوف کو ابھی تک نہیں دیا گیا۔ اور یہ کہ جس سوویٹ ادبی کارنامے پر یہ اعزاز دیا گیا اسے ایک غیر ملک میں مرتب کیا گیا تھا اور خود اپنے ملک میں یہ ادبی کارنامہ ابھی تک ممنوع ہے۔

الجیریا کی جنگ آزادی اور ژاں پال سارتر :

اس کے متوازی ایک اور واقعہ بھی ہے؛ الجیریا کی جنگ آزادی کے دوران میں ہم نے "ایک سو اکیس (ادیبوں) کے اعلان" پر دستخط کیے تھے۔ اُس وقت میں یہ اعزاز شکریے کے ساتھ قبول کر لیتا کیوں کہ اُس وقت یہ اعزاز نہ صرف میرے لیے ہوتا بلکہ اُس آزادی کے لیے بھی ہوتا جس کے لیے ہم

جد و جہد کر رہے تھے ۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہ انعام مجھے اُس وقت پیش کیا گیا ہے جب وہ جد و جہد ختم ہو چکی ہے ۔

نوبل پرائز اور سیاسیات :

سویڈن کی اکادمی کے اغراض و مقاصد میں 'آزادی' بھی شامل ہے : اس لفظ کی کئی تفسیریں ہو سکتی ہیں ؛ مغرب میں اس لفظ کو ایک مجموعی حیثیت سے سمجھا جاتا ہے ۔ میرے نزدیک آزادی کے مفہوم کے لیے محض یہ کافی نہیں کہ ایک فرد کو ایک سے زیادہ جوڑی جوتے رکھنے کا حق حاصل ہو یا جب بھوک لگے تو کھانا ملنے کا یقین ہو جائے ۔

میرے خیال میں اس انعام کو قبول کرنے سے انکار کردینا کم خطرناک ہے بمقابلہ اس کے کہ اسے قبول کر لیا جائے ۔ اگر میں اسے قبول کر لوں تو معروضی حیثیت سے یہ رجعت قہقری کے مترادف ہوگا ۔ میں نے اخبار 'فگارو' کے ادبی ضمیمے میں ایک مضمون پڑھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "میں اپنے اس سیاسی مؤقف پر اب سختی سے کاربند نہیں

رہا جو ماضی میں ایک اختلافی مسئلہ بنا رہا ہے - میں جانتا ہوں کہ یہ آرٹیکل (سویڈن کی) اکادمی کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا لیکن یہ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اگر میں یہ انعام قبول کر لیتا تو میرے اس عمل کو بائیں بازو کے حلقوں میں کیا معنی پہنائے جاتے - ماضی میں میرے سیاسی نظریات اختلافی مسئلہ بنے رہے لیکن وہ مجھے ہمیشہ سے عزیز ہیں ، حالانکہ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ بعض اوقات میرے ساتھی بھی غلطی کر سکتے ہیں -

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ نوبل پرائز ایک بورژوا انعام ہے لیکن ان حلقوں میں جنھیں میں جانتا ہوں ، اس انعام کو لازمی طور پر یہی معنی دیے جائیں گے -

آخر میں میں اس انعام کے مالی پہلو کی طرف آتا ہوں ؛ جب اکادمی کسی ادیب کو یہ اعزاز بخشتی ہے تو اس کے ساتھ ایک بڑی رقم کا بوجھ بھی اس کے کاندھوں پر رکھ دیتی ہے - یہ صورت حال میرے لیے کافی اذیت کا باعث ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اعزاز

منظور کرنے اور انعام کی رقم حاصل کرنے کے بعد ادیب اس رقم سے اس ادارے یا تحریک کی امداد کرسکتا ہے جسے وہ اہم سمجھتا ہو ۔ اس وقت میرے ذہن میں لندن کی نسلی امتیاز کی کمیٹی کا نام ہے ؛ عمومی وجوہ کی بنا پر اس انعام سے انکار کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ تحریک ایک امداد سے محروم ہو جائے گی جس کی اسے ضرورت ہے ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ نقطۂ نظر غلط ہے ۔ میں دو لاکھ پچیس ہزار کراؤن سے اس لیے انکار کرتا ہوں کہ میں مشرق یا مغرب کے کسی ادارے سے وابستہ ہونا نہیں چاہتا ۔ ظاہر ہے کہ دو لاکھ پچیس ہزار کراؤن دے کر کسی سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسے اصول اختیار کرے جو خصوصیت سے اس کے نہیں ہیں اور اس کے ساتھیوں کے بھی نہیں ہیں ۔

ممکن ہے جو کچھ میں نے کہا ہے ، وہ بعض حضرات پر گراں گزرے لیکن نوبل پرائز کی پیش کش کے بارے میں یہ میرے ذاتی خیالات اور اپنے انکار کے اسباب و وجوہ کے بارے

میں صحیح تاثرات ہیں جن کی وضاحت میرے لیے ناگزیر تھی۔

میں اس اعلان کو سویڈش عوام کی محبت اور یگانگت کے پرخلوص اظہار پر ختم کرتا ہوں۔"

ژاں پال سارتر کا بیان

ایک لمحۂ فکریہ

گزشتہ مضمون میں میں نے ژاں پال سارتر کے اُس تاریخی اعلان کے فرانسیسی متن کا ترجمہ پیش کیا تھا ، جس میں اُس نے نوبل پرائز قبول نہ کرنے کے وجوہ بیان کیے تھے ۔ یہ اعلان ادبی تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے ، کیوں کہ اس میں ادبی روایات قائم کرنے کے لیے کچھ نئی قدریں وضع کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔ یہ اعلان دنیا کے تمام اہل قلم حضرات کو دعوت فکر دیتا ہے ۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس بیان کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر لیا جائے ۔

ژاں پال سارتر کے اعلان میں پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ انکار کی وجہ اُس کے ذاتی نظریات ہیں جنھیں وہ کسی دوسرے پر مسلط نہیں کرنا چاہتا ۔ اس انعام کو قبول کرنے سے انکار کی اہم وجہ وہ یہ قرار دیتا ہے کہ جب کوئی اہل قلم اس قسم کا کوئی امتیاز یا اعزاز قبول

کرلیتا ہے تو وہ اُس انجمن یا ادارے کو بھی الجھا لیتا ہے جس نے اُسے یہ اعزاز دیا ۔ اہل قلم کو فرد رہنا چاہیے ، ادارہ یا انجمن نہ بن جانا چاہیے ۔ انفرادیت کی اہمیت کا احساس سارتر کی دیگر تصانیف میں بھی ملتا ہے ۔ اور 'وجودیت' کے فلسفے کا (جس کا وہ امام ہے) ایک اہم جزو ہے ۔ سارتر کا خیال ہے کہ ادب کی بلند شخصیتیں ایک اہم انفرادیت کی مالک ہوتی ہیں ، اور ایک عظیم نقطۂ نظر ، ایک فلسفے یا ایک مشن کی مظہر ہوتی ہیں ۔ اس لیے اگر کوئی بڑا اہل قلم کسی ادارے کا اعزاز قبول کر لے تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ انعام ادیب کو اس کی شخصیت کی برتری پر نہیں دیا گیا بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ادارہ اس ادیب کے نقطۂ نظر ، اس کے فلسفے یا اُس کے مشن سے متاثر ہے یا اس کا مبلغ ہے ۔

اسی طرح اس مفروضے کا مخالف پہلو بھی زیر بحث آ سکتا ہے؛ یعنی یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اہل قلم جس کو یہ اعزاز دیا گیا ، وہ خود اعزاز دینے والے ادارے کے نقطۂ نظر سے متاثر ہوگیا ہے ۔ ژاں پال سارتر کے خیال میں یہ ایک نہایت افسوسناک بات ہوگی اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ جس اہل قلم کو اعزاز دیا گیا ، وہ اعزاز دینے والے ادارے کے نظریات سے متاثر یا متفق ہے ۔

مختصر یہ کہ کوئی ادبی اعزاز یا انعام قبول کرنے سے

یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اہل قلم ، جسے وہ اعزاز دیا گیا ، اُسی نقطہٗ نظر کا حامل ہے جس کی اشاعت یا تبلیغ انعام دینے والا ادارہ کرتا ہے ۔

سارتر نے اپنے اعلان میں مثالیں دے کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ سویڈن کی اکادمی (جو نوبل پرائز دیتی ہے) سوشلزم کی مخالف ہے ۔ یہی نہیں بلکہ وہ ان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہے جو سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں (مثلاً پاسترنک) اور اُن عظیم اہل قلم کی طرف توجہ نہیں کرتی جو سوشلزم یا اُن ممالک سے تعلق رکھتے ہیں جہاں سوشلزم نے جنم لیا (مثلاً روس کا مشہور و معروف ادیب شولوخوف جس نے 'اور ڈان بہتا رہا' جیسا عظیم ناول لکھا ہے) ۔

اس صورت حال کے پیش نظر سارتر نے اُس ادارے کے اعزاز اور انعام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اس کے خیال میں سیاسی گروہ بندی میں دانستہ یا نادانستہ طور پر شامل ہو گیا ہے ۔

سارتر کے اعلان کا تجزیہ کرنے سے دو اہم مسائل اُبھرتے ہیں ۔

سارتر انسانیت کی آزادی کا حامی ہے :

اول تو یہ کہ سارتر نوبل پرائز کا فی نفسہ مخالف

نہیں ہے ۔ اُن تمام خیالات کے باوجود جو اُس نے اس انعام کی مخالفت میں بیان کیے ہیں ، اُس نے اُن اہل قلم کی مخالفت نہیں کی ہے جو یہ انعام حاصل کر چکے ہیں ، (اور جن میں فرانسیسی ادیبوں کی بھی بڑی تعداد شامل ہے) بلکہ ان حضرات سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ۔ یہی نہیں ، اُس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر الجیریا کی جنگ آزادی کے دوران اُسے یہ انعام پیش کیا جاتا تو وہ اسے قبول کر لیتا ۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ، الجیریا کی جنگ آزادی فرانس کے خلاف تھی جو سارتر کا وطن ہے ۔ لیکن اُس نے الجیریا کے مسلمانوں کی جنگ آزادی کا ساتھ دیا کیوں کہ یہ انسانیت کی آزادی کی جنگ تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ملک فرانس کا شمار اُن ملکوں میں ہو جو انسانیت کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

مشرقی ثقافت اور سارتر :

دوسرے یہ کہ سارتر مغرب کے ایک امیر اور متمدن ملک فرانس کا باشندہ اور ایک بورژوا خاندان کا فرد ہونے کے باوجود مشرقی تمدن اور انداز فکر کا پرستار ہے ۔ اُسے مشرقی تمدن کی اہمیت کا شدید طور پر احساس ہے اور اُس نے اس کی اہمیت پر اپنے اعلان میں زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت ثقافتی محاذ پر ایک ہی

جد و جہد جاری ہے اور وہ ہے مشرق اور مغربی ثقافت کی جد و جہد۔ پر امن بقائے باہمی کے لیے سارتر دونوں ثقافتوں سے متاثر ہے لیکن مشرقی ثقافت کی طرف زیادہ مائل ہے۔ مشرق اور مغرب کی ثقافتی کش مکش اور مشرقی ثقافت کی اہمیت کے بارے میں اس صدی کے کسی مغربی مفکر نے غالباً سارتر سے زیادہ واضح طور پر اظہار خیال نہیں کیا۔

ادبی انعام دینے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ :

نوبل پرائز سے انکار پر سارتر کا تاریخی اعلان ادبی انعام دینے والے اداروں کو بھی دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ان اداروں کو اس واقعے سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دینا چاہیے کہ جب وہ ادبی انعام دینے کا فیصلہ کریں تو اُن کے سامنے ادیب کی شخصیت ہونی چاہیے ؛ اُس کے سیاسی رجحانات سے ان اداروں کو متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ ادب تنقیدِ حیات ہے اور ادیب اس تنقید میں آزاد ہے۔ جن ملکوں میں ادیب کو تنقید حیات کی آزادی نہیں ملتی ، وہاں عظیم ادب پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ادب کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے والے ادارے شعوری اور غیر شعوری طور پر اس آزادی کی قدر نہیں کریں گے تو ادیبوں کا اعتماد ان اداروں سے اُٹھ جائے گا۔

اور پھر ان ادبی 'اعزازات' کی حیثیت محض اس 'امداد' کی رہ جائے گی جو امیر ملک اپنے نظریات کے پراپیگنڈے کے لیے دوسرے درجے کے لکھنے والوں کو دیا کرتے ہیں۔

اس اظہار سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سویڈن کی اکادمی واقعی اس الزام کی مستحق ہے جس کی طرف سارتر نے اشارے کیے ہیں۔ ممکن ہے حساس سارتر کو غلط فہمی ہوئی ہو، لیکن اس اعلان پر غور کرنے اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اعزاز اور امداد :

ہمارے ملک میں بھی ایسے ادارے موجود ہیں جو ادبی کارناموں پر اعزاز اور انعام دیتے ہیں۔ جو اہل ثروت حضرات ان اداروں کی مالی اعانت کر رہے ہیں وہ قوم کے شکریے کے مستحق ہیں۔ خوش قسمتی سے ابھی تک ان اداروں کے عمل سے کوئی ایسی بات ظاہر نہیں ہوئی جس سے سیاسی گروہ بندی یا دیگر غیر ادبی عناصر کے اثرات کا شبہ کیا جا سکے۔ ان اداروں کے ارباب اختیار اور مجلس مشاورت میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جن کی علمی دیانت پر ملک کے اہل قلم کو اعتماد ہے۔ البتہ انعام دینے کے طریق کار میں ایک بات ذرا کھٹکتی

ہے ؟ انعام کا فیصلہ کرنے کے لیے ادیب سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ یا اُس کی طرف سے کوئی اور شخص کتاب کے چند نسخے ادارے کو ارسال کرے ۔ جو کتابیں ادارے کو بھیجی جاتی ہیں صرف اُنھی کی ادبی قدر و قیمت کو متعین کرکے انعام کا فیصلہ کیا جاتا ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے متمدن ممالک میں بھی یہی قاعدہ ہے یا نہیں ، اور ممکن ہے اس طریقۂ کار کو ملک میں قائم رکھنے کے معقول وجوہ بھی ہوں ۔ لیکن بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اعزاز دینے کے اس طریقۂ کار میں ادیب کی حیثیت ایک درخواست گزار کی ہو جاتی ہے اور 'اعزاز' ، 'امداد' کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اگر صورت حال واقعی ایسی ہے تو ممکن ہے کہ بعض ادیب اسے پسند نہ کریں ۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ادبی انعام ملک کے بہترین ادب کی تخلیق پر نہیں بلکہ اُن تخلیقات پر دیا جائے جنھیں انعام کی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے ۔

اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ممکن ہے انعام کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی کے علم میں بعض ایسی مطبوعات بھی ہوں جنھیں وہ بہترین تصور کرتی ہو لیکن کمیٹی کسی طور بھی انھیں انعام و اعزاز کا مستحق قرار نہیں دے سکتی کیوں کہ وہ مطبوعات 'باقاعدہ' مقابلے کے لیے پیش نہیں کی گئیں ۔

متمدن دنیا میں اب ادیب کی حیثیت کافی بدل چکی ہے ۔ اب عظیم ادیب کی پرورش کا زمانہ نہیں رہا ۔ ادیب خود قوم کا سرمایہ ہے ۔ جس طرح کسی ملک کی مالی حیثیت کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ اس کے بنکوں میں سونا اور زر مبادلہ کتنا ہے ، اسی طرح کسی ملک کی ثقافتی حیثیت کا اندازہ اس کے ادیبوں اور دانش وروں سے لگایا جاتا ہے ۔ اس لیے کسی ادیب اور دانش ور کو جب قوم اعزاز دیتی ہے تو وہ دراصل خود اپنی ثقافت کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے ۔ ادیب یا دانش ور پر احسان نہیں کرتی ۔

اعزاز اور امداد میں فرق ہے ۔ اعزاز کی نوعیت امداد سے جداگانہ ہے ۔ ادبی اعزاز یا انعام کسی ادیب کو اس لیے پیش کیا جانا چاہیے کہ اس نے ملک و قوم کو سربلند کیا ہے اور وہ بجا طور پر اس کا مستحق ہے ۔ اس سے نہ صرف ملک و قوم ، ادبی اداروں اور اعزاز کا وقار بلند ہوگا بلکہ ادیب کے احساسات بھی مجروح نہ ہوں گے ۔

یہ میرے ذاتی خیالات ہیں ۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انعامات کے طریق کار میں تبدیلی کے بارے میں میرے معروضات پر غور فرمایا جائے تو نامناسب نہ ہوگا ۔

مسلمانوں کا پیرس پر حملہ

ہر ملک کے اہم تاریخی واقعات کا ذکر عموماً اس کے ادب میں ملتا ہے۔ تقریباً ہر ملک کے قدیم ادب میں ایسی رزمیہ نظمیں ملتی ہیں جن میں قدیم بادشاہوں اور میدان جنگ میں اُن کے وزیروں اور سپہ سالاروں کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ فرانس کی گزشتہ دو ہزار سال کی تاریخ میں پیرس پر کئی حملے ہوئے۔ لیکن ایک حملے کا ذکر فرانسیسی ادب میں غالباً سب سے زیادہ زور و شور سے کیا گیا ہے۔ یہ مسلمانوں کے پیرس پر حملے کا ذکر ہے جو قدیم گیتوں اور رزمیہ نظموں میں کیا گیا ہے۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ "حملہ" پیرس پر کبھی نہیں ہوا۔

گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں فرانسیسی زبان ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی؛ جسے ہم اب ادب کا نام دیتے ہیں، اس قسم کی کوئی تخلیق اس سے پہلے فرانس میں موجود نہیں تھی۔ دنیا کی بیشتر قوموں کے

ادب کی طرح فرانس میں بھی ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی ۔ گیت اور نظمیں کہی جاتی تھیں جنھیں شاعر یا مغنی ایک ساز وائی (Vielle) پر گاتے تھے جو سارنگی سے مشابہ تھا ۔ یہ شاعر یا مغنی شہر شہر ، گاؤں گاؤں پھرتے تھے اور اُمراء کی حویلیوں کے سامنے یہ گیت ساز پر گاتے تھے ۔ تقریباً اسی طرح جیسے اب بھی پنجاب اور سندھ کے دیہاتی مغنی ہیر رانجھا ، سسی پنوں ، مرزا صاحباں کی منظوم کہانیاں سارنگی یا اسی قسم کے دوسرے مخصوص سازوں پر سناتے ہیں ۔

گیارھویں صدی عیسوی کے آخر اور بارھویں صدی میں کچھ اسی قسم کے گیت گائے جاتے تھے جنھیں شانسوں د ژیست (Chansons De Geste) یعنی 'کارناموں کے گیت' کہا جاتا ہے ۔ ان گیتوں میں قدیم فرانسیسی بادشاہوں ، سپہ سالاروں اور سپاہیوں کے جنگی کارناموں کا ذکر ہے ۔ لیکن ان کا مقصد محض تفریح ہی نہیں تھا ، یہ گیت ایک اور مقصد سے بھی کہے گئے تھے : جس زمانے میں یہ گیت گائے جاتے تھے ، وہ یورپ میں صلیبی جنگوں کا زمانہ تھا[1] ۔ یورپ کو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ تھا ، اور اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے

---

(۱) ابتدائی چار صلیبی جنگیں اسی زمانے میں ہوئیں ، یعنی ۱۰۹۵ع ، ۱۱۴۷ع ، ۱۱۸۹ع اور ۱۲۰۰ع میں ۔

صلیبی جنگوں کے لیے بھرتی بڑے زور و شور سے جاری تھی ۔ لیکن صلیبی جنگوں میں شامل ہونے کے لیے جوش زیادہ تر ان علاقوں میں پایا جاتا تھا جو اسپین یا ان ممالک کے قریب تھے جہاں مسلمان پہنچ چکے تھے ۔ شمالی فرانس سے مسلمان ابھی بہت دور تھے ۔ وہاں کے لوگوں میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے کوئی خاص جوش موجود نہ تھا ۔ اس لیے غالباً ارباب حکومت و کلیسا (اور تاریخ شاہد ہے کہ یہ بہ ظاہر متضاد ادارے عوام کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اکثر ایک دوسرے کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے رہے ہیں) کے زیر اثر ایسے گیت کہے گئے ہیں جن کا مقصد فرانسیسی عوام میں مسلمانوں کے خلاف منافرت اور انتقام کے جذبات بھڑکانا تھا ۔ اس کام میں ذرا دشواری یہ تھی کہ یہ بے چارے فرانسیسی عوام جانتے ہی نہ تھے کہ یہ مسلمان کون ہیں ، اس لیے ان سے نفرت کیوں کر کی جائے ؟ کسی سے نفرت کرنے کے لیے کچھ اسباب تو ہونے ہی چاہییں ۔ چناں چہ ان گیتوں میں 'تاریخی' کہانیاں بیان کی گئی ہیں ۔ ان 'تاریخی' کہانیوں میں کہا گیا ہے کہ دو تین سو سال پہلے شاہ شارلمان کے زمانے میں مسلمانوں[1] نے فرانس پر بہت سے حملے کیے تھے ۔ فرانسیسی

---

(۱) اس زمانے میں مسلمان مجاہدین کو فرانسیسی زبان میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

بادشاہوں ، سپہ سالاروں اور عوام پر ظلم کیا تھا ، اس لیے اس ظلم کا انتقام مسلمانوں سے لینا چاہیے ۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ صلیبی جنگوں میں جوش و خروش سے شرکت کی جائے ۔ ان حملوں اور مظالم کی تفصیل جن گیتوں میں بیان کی گئی ہے ، وہ بہت طویل ہیں ۔ ان میں سے بعض گیت تو بیس ہزار سے زائد اشعار پر مشتمل ہیں ۔ ان کہانیوں میں مسلمانوں کے پیرس پر "حملہ" کا بھی ذکر ہے ۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، مسلمانوں نے

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)
Sarrasius کہا جاتا تھا ۔ یہ لفظ لاطینی Sarracсni سے ماخوذ ہے جو ایک قدیم قبیلے کا نام ہو ۔ یورپ کے قرون وسطیٰ کے ماہرین اشتقاقیات اس لفظ کا تعلق سارہ (حضرت ابراہیم کی زوجہ) سے بیان کرتے تھے ۔ فرانسیسی رزمیہ نظموں میں مسلمانوں (ساراسینیوں) کے ذکر کے متعلق دیکھیے : ولیم وسٹر کمفورٹ William Wister Comfort کا مضمون بہ عنوان :
The Literary Role of Saracens in the French Epic. "Journal of Modern Language Association of America." کی جلد ۳۵ ستمبر ، ۱۹۴۰ع شمارہ ۳ صفحات ۵۹ - ۶۲۸ پر شائع ہوا ۔ اور مزید دیکھیے E. Langlois کی کتاب موسومہ "Table des noms propres de toute nature contenus les Chansons de geste." (Paris, 1904) صفحہ ۱۲۷ ۔

پیرس پر کبھی حملہ نہیں کیا ۔ آٹھویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان مسلمان جنوبی فرانس میں پواتیے (Poitiers) کے مقام تک آئے تھے ۔ اس کے بعد عیسائیوں اور مسلمانوں کا نقطۂ اتصال پہلے اسپین اور بعد میں بحیرہ روم کے مشرقی سرے پر رہا ۔

ان گیتوں کا بہترین اور غالباً سب سے قدیم مخطوطہ آکسفرڈ کی باڈلین لائبریری میں موجود ہے جو ۱۱۷۰ء میں لکھا گیا تھا ۔ یہ مخطوطہ ایک طویل رزمیہ نظم لا شانسوں د رولاں (La Chanson de Roland) پر مشتمل ہے ۔ اس کے مصنف کے نام کا صحیح پتا نہیں چلتا ۔ ہماری شاعری کی طرح فرانسیسی شعرا اس زمانے میں اکثر اپنا نام یا تخلص نہیں دیتے تھے ۔ نظم کے آخر میں یہ الفاظ تحریر ہیں :

"یہاں اس کارنامے (کا بیان) ختم ہوتا ہے
جو تورول نے کیا ۔"

اب سوال یہ ہے کہ یہ 'تورول' کس کا نام ہے ؟ اصل قدیم فرانسیسی متن میں لفظ Declinet لکھا ہے جس کے لیے جدید فرانسیسی زبان میں فعل decliner ہے ۔ فرانسیسی زبان میں یہاں اس فعل کے تین معنی ہو سکتے ہیں ، (یعنی اردو کے فعل "کیا" کا فاعل تین طرح کا ہو سکتا ہے) ۔ تورول یہ اشعار 'کہنے والا' بھی ہو سکتا

ہے ، 'لکھنے والا' بھی اور 'گانے والا' بھی - معلوم نہیں تورول ان تینوں میں سے کس کا نام تھا[1] -

اس مخطوطے کو بیدیے (Bedier) نے پیرس سے شائع کیا ہے - ایک صفحے پر 'لا شانسوں د رولاں' یعنی رولاں کا گیت کا قدیم فرانسیسی متن ہے اور سامنے کے صفحے پر قدیم فرانسیسی متن کا جدید فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے - اس ایڈیشن کے ساتھ بیدیے نے ایک تحقیقی مقالہ مقدمے کے طور پر لکھا ہے جس میں اس نظم کے ماخذ وغیرہ کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے - اس کتاب میں چار ہزار دو سو اشعار ہیں - اس نظم میں جو داستان بیان کی گئی ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ اس نظم کا ہیرو رولاں شہنشاہ فرانس شارلمان کا بھتیجا تھا - وہ ایک جنگ کے دوران میں لشکر سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ مسلمانوں کی فوج میں گھر جاتا ہے[2] اور آخرکار مارا جاتا ہے - کچھ عرصہ بعد شارلمان

---

(۱) دیکھیے Surer اور Castex کی کتاب 'فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ' (Manuel des etudes litteraires Francaises) جلد اول - (قرون وسطیٰ) صفحہ ۱۰ - اس مضمون کی تیاری میں میں نے کئی جگہ اس کتاب سے استفادہ کیا ہے -

(۲) تاریخی اعتبار سے یہ مسلمان نہیں بلکہ عیسائی ہی تھے - اس کا اعتراف مذکورہ بالا کتاب میں کیا گیا ہے - ملاحظہ ہو صفحہ ۹ -

اس کے قتل کا انتقام لیتا ہے ۔ مسلمانوں کو شکست ہوتی ہے اور شارلمان ایک مور ملکہ کو عیسائی بنا کر اس سے شادی کر لیتا ہے ۔

اس داستان میں مسلمانوں کو بہت طاقت ور اور ظالم ظاہر کیا گیا ہے بلکہ بعض جگہ انھیں جادوگر ظاہر کیا گیا ہے ۔ ایک مقام پر بیان کیا گیا ہے کہ یہ مسلمان بڑھتے بڑھتے پیرس کے قرب و جوار تک پہنچ جاتے ہیں اور پیرس کا محاصرہ کر لیتے ہیں ۔ یہ محاصرہ طویل مدت تک جاری رہا ہے ۔ مسلمانوں کا سپہ سالار شاہ فرانس کو چیلنج پر چیلنج دیتا ہے ۔ ایک جگہ مسلمان سپہ سالار کہتا ہے :

"ایک سال ختم ہونے سے پہلے ہم فرانس فتح کرلیں گے اور سین دانی[1] کو اپنا دارالحکومت بنائیں گے ۔"

(رولاں کا گیت اشعار نمبر ۹۷۰ تا ۹۷۳)

فرانسیسی پیرس میں محصور ہیں اور طرح طرح کی تکالیف سے دو چار ہیں ۔ اس کی تفصیلات میں کوئی ڈیڑھ سو اشعار کہے گئے ہیں ۔ مسلمانوں کو جی بھر کے برا بھلا کہا گیا ہے ۔ آخر کار فرانسیسی فوج مسلمانوں کو شکست دیتی ہے اور پیرس کا محاصرہ ختم ہو جاتا ہے ۔

---

(۱) سین دانی Saint Denis موجودہ پیرس کا ایک حصہ ہے ۔

اس نظم اور اس قسم کی دوسری نظموں میں جہاں مسلمانوں کے عیب گنوائے گئے ہیں اور انھیں ظالم اور جابر قرار دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی ، وہاں کہیں کہیں مسلمان سپاہیوں اور سپہ سالاروں کے حسن اور شجاعت کی تعریف بھی کی گئی ہے ۔ مثلاً رولاں کے گیت میں سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو :

"اس (مسلمان سپہ سالار) نے اپنا بھاری زرہ اٹھایا ۔ وہ ہتھیار سے لیس گھوڑے پر سوار تھا . . . . اس کا چہرہ بہار کے پھول کی مانند دمک رہا تھا ۔ وہ حسن اور شجاعت کا نمونہ تھا ۔ اے خدا ! کیا سجیلا شہزادہ تھا ! کاش وہ عیسائی ہوتا ۔"

(رولاں کا گیت ۔ اشعار ۳۱۵۸ تا ۳۱۶۴)

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جس رزمیہ شاعری سے فرانسیسی ادب کی ابتدا ہوئی ہے ، اس میں مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے ۔ در اصل فرانسیسی عوام کو مسلمانوں سے کوئی مخاصمت نہ تھی ۔ ان نظموں میں جو کچھ کہا گیا ہے ، وہ محض جنگی اغراض کے لیے تھا[۱] ۔

(۱) یہ رائے بیدیے کی بھی ہے ۔ ملاحظہ ہو لا شانسو د رولاں (مقدمہ) ۔ فرانسیسی ادبیات کے بارے میں جس کتاب کا اس مضمون میں حوالہ دیا گیا ہے ، اس کے مصنفین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے ۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۹ ۔

یوں اس قسم کی رزمیہ نظمیں تقریباً دنیا کے ہر ادب میں ملیں گی۔ خود ہماری زبان میں ایسے ناولوں، قصے کہانیوں، جنگ ناموں کی کمی نہیں جن میں 'لشکر اسلام' نے کفار سے جنگ کی، 'کفار' کو شکست فاش ہوئی، اور سپہ سالار کسی غیر مسلم دوشیزہ کو مشرف بہ اسلام کرنے کے بعد نکاح میں لے آیا۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر کہانیوں کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ ادب نے اکثر تاریخ کو رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ادب تاریخ نہیں ہوتا لیکن بعض اوقات تاریخ پر ایک نئے زاویے سے روشنی ضرور ڈالتا ہے۔

تحقیقی اداروں میں باہمی ربط کی ضرورت

میں نے یورپ میں قیام کے دوران میں دیکھا کہ کئی علمی اداروں میں اردو زبان کی تعلیم میں اچھی خاصی دل چسپی لی جا رہی ہے - بعض اداروں میں اردو کی تعلیم میں اضافہ ہو رہا ہے اور بعض ملکوں میں (ہماری بے نیازی اور اردو کی طرف سے بے اعتنائی کے سبب) اردو زبان سے دل چسپی کم ہو رہی ہے - لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان اداروں میں آپس میں کوئی ربط نہیں - مثلاً پیرس کا ادارہ نہیں جانتا کہ لندن میں کس موضوع پر کام ہو رہا ہے - لندن کے شعبۂ اردو کو یہ خبر نہیں کہ نیپلز یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں کیا تحقیق ہو رہی ہے - اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم پاکستانی جو اردو کو اپنی قومی زبان کہتے ہیں، ان اداروں کی کارگزاریوں سے تقریباً نا واقف ہیں - ہماری یونیورسٹیوں اور اردو کی ترویج کے اداروں کا یورپ میں اردو کے اساتذہ اور اداروں سے کوئی

باقاعدہ ربط و تعلق نہیں ۔

اس بے پروائی کے نتائج بہت افسوس ناک ہوئے ہیں ۔ اردو زبان کا یورپ میں ڈیڑھ سو سال ہوئے بہت چرچا تھا اور وہ برصغیر پاک و ہند کی ثقافتی زبان مانی جاتی تھی ۔ لیکن اب یورپ کے کئی اداروں میں اس کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے ۔ اور اس کے برعکس ہندی زبان جس کا وجود دوسری عالمی جنگ سے پہلے یورپ میں نہ ہونے کے برابر تھا ، اب رفتہ رفتہ مقبول ہوتی جا رہی ہے ۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ یورپ بلکہ دنیا میں جن اداروں میں اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے ، ان میں باہمی ربط پیدا کیا جائے اور معلومات کے تبادلے کے لیے منضبط کوشش کی جائے ۔ یورپ میں بھی مجموعی طور پر تمام مشرقی زبانوں کی تعلیم کے اداروں کی یہی صورت ہے ۔ اس ضمن میں میں نے متعدد اساتذہ سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کیا اور ان سب کو اس امر پر متفق پایا کہ مشرقی زبانوں کے تعلیمی اداروں میں معلومات کے تبادلے کے لیے بہتر ذرائع فراہم کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ ان اداروں کو نہ صرف یہ معلوم ہو سکے کہ اسی قسم کے دوسرے اداروں اور یونیورسٹیوں میں کیا کام ہو رہا ہے بلکہ یہ بھی کہ ان علوم کی تعلیم و تحقیق کے مسائل کیا ہیں اور انھیں حل کرنے کے لیے کیا کیا

جا سکتا ہے - اس سلسلے میں کیمبرج یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے استاد اور مشہور محقق پروفیسر آربری سے ۱۹۶۴ء کے شروع میں میری ملاقات کیمبرج میں ہوئی - انھوں نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا کہ مشرقیات کی تعلیم کے اداروں میں معلومات کے تبادلے کے لیے ایک سال میں دو یا تین مرتبہ ایک جریدہ شائع کیا جائے جس میں ان اداروں کی کارروائی ، اہم علمی خبریں اور تحقیقی مقالوں کی تلخیص شائع ہو - اس سے نہ صرف مشرقیات کے اداروں کو ایک دوسرے کے کوائف اور مسائل کا علم ہوتا رہے گا بلکہ تحقیقی کام میں بھی بہت مدد ملے گی[1] -

مشرقیات کے بارے میں یہ تجویز میں نے اہل علم کی خدمت میں پیش کر دی ہے اور ابھی نتائج سے نا امید نہیں ہوا - اس ضمن میں اردو زبان کی مزید توسیع و ترقی کے لیے اب تک جو اقدامات میں نے اپنے طور پر کیے اور ان کا جو نتیجہ نکلا ، وہ مختصراً حسب ذیل ہے :

۱ - پیرس میں اردو کے استاد موسیو گمبرتیر سے کہہ کر میں نے ۱۹۶۳ء میں چار ہزار فرانک (مساوی چار ہزار روپے) سالانہ کی گرانٹ اردو کتابوں کی خریداری

(۱) اس ملاقات کے بارے میں ایک مضمون اس کتاب میں شامل ہے -

کے لیے حکومت فرانس سے منظور کرائی ۔ اردو کے استاد آندرے گمبرتیر نے میری استدعا پر ایک مفصل نوٹ لکھا جس میں انھوں نے پیرس میں اردو زبان کی تعلیم کے مسائل کا ذکر کیا ہے ۔ یہ نوٹ میں نے ترقی اردو بورڈ کو ارسال کیا ۔ بورڈ نے اس کی نقلیں کرا کے پاکستان کی یونیورسٹیوں اور اداروں کو ارسال کیں تاکہ وہ ان مسائل کی طرف توجہ فرمائیں اور موسیو گمبرتیر نے جو کچھ لکھا ہے اس پر تبصرہ کریں ۔ انجمن ترقی اردو نے چند کتابیں مجھے پیرس بھیجیں جو میں نے متعلقہ شعبے کو پاکستان کی طرف سے تحفے کے طور پر پیش کر دیں ۔ اس عنایت کے لیے میں انجمن کا ممنون ہوں ۔ اس کے علاوہ اور کہیں سے تبصرہ یا جواب ابھی تک مجھے یا اردو بورڈ کو نہیں ملا ۔

۲ ۔ اردو زبان و ادب کے بارے میں جو علمی مضامین رسائل میں شائع ہوتے ہیں ، ان کی تلخیص و اشاریہ (Documentation) کا سلسلہ میں نے 'اردو نامہ' میں شروع کیا تھا ۔ اس کی پہلی قسط 'اردو نامہ' کے شمارہ ۱۶ ، اپریل تا جون ، ۱۹۶۴ع میں شائع ہو چکی ہے ۔ ترقی اردو بورڈ کے سکریٹری جناب شان الحق حقی نے انتظام کیا کہ ہر شمارہ یورپ کی ان جامعات کو

بھیجا جائے جہاں اردو کی تعلیم ہوتی ہے تاکہ اس طرح یورپ میں اردو زبان کے طلبا اور اساتذہ کو زبان و ادب میں تحقیقی کام کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں ۔[1]

۳ ۔ اسی اشاریے میں میں نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ پاکستانی اور بیرونی یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے اساتذہ ایم ۔ اے اور پی ایچ ۔ ڈی کے طلبا کے لکھے ہوئے مقالات کی تلخیص ارسال فرما دیں تاکہ انھیں اسی سلسلۂ مضامین میں شامل کیا جائے ۔ اس کے علاوہ شعبۂ اردو میں تحقیقی کام کے بارے میں دیگر تفصیلات بھی بہم پہنچائیں تاکہ ان کی اشاعت سے دنیا میں اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والی یونیورسٹیوں اور اداروں کو ایک دوسرے کی کارگزاریوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں ۔

۴ ۔ میں نے ذاتی طور پر یورپ میں اردو زبان کے اساتذہ سے ربط پیدا کیا اور ان سے یورپ میں اردو کی تعلیم کے مسائل کے بارے میں خط و کتابت جاری ہے ۔ اردو ادب کے اساتذہ ، اہلِ علم حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ اس اہم مسئلے کی طرف توجہ فرمائیں ۔

---

(۱) افسوس ہے کہ بعض دشواریوں کی وجہ سے یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا ۔

اس زمانے میں علمی اور تحقیقی کام انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں سے ہوتا ہے اور ان دونوں صورتوں میں یہ ضروری ہے کہ ایک فرد یا ادارہ واقف ہو کہ دوسرے افراد یا ادارے کیا کر رہے ہیں[1] اس لیے معلومات کے تبادلے کے لیے منظم کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان و ہندوستان میں بھی اور دیگر ممالک میں بھی۔

---

(۱) اس ناواقفیت کے نتائج کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ دو تین سال میں رتن ناتھ سرشار پر ڈاکٹریٹ کے لیے دو مقالے صرف ہندوستان میں لکھے گئے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے رسل صاحب نے لندن سے مجھے مطلع کیا ہے کہ اسی موضوع پر لندن یونیورسٹی سے بھی ایک خاتون کو اسی سال ڈاکٹریٹ دی گئی ہے۔

مغل فن تعمیر ایک فرانسیسی دانش ور کی نظر میں

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں کئی فرانسیسی سیاح اور دانش ور ہندوستان آئے۔ ان میں سے بعض سال ہا سال ہندوستان میں رہے اور ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، تمدن، معاشرت وغیرہ پر تحقیق کی اور کتابیں لکھیں۔ بعض ایسے بھی تھے جو زیادہ عرصہ ہندوستان میں نہیں رہے لیکن انھوں نے اپنے سفر کے متعلق تاثرات قلم بند کیے ہیں جو بعض صورتوں میں فرانسیسی ادب کا حصہ بن گئے ہیں۔ ان دانش وروں میں سے ایک "پیر لوتی"[1] بھی تھا۔

---

(۱) پیر لوتی Pierre Loti (زیادہ صحیح تلفظ: پی ایغ لوتی) کا اصل نام ژولین ویو (Julien Viaud) تھا۔ لوتی کے حالات مندرجہ ذیل کتب سے لیے گئے ہیں:

Ch- M. Des Granges.
"Histoire de la litterature Francaise."

اور

P. Castex, "Manuel des etudes litteraires Francaise."

لوتی (پیدائش ۱۸۵۰ء - وفات ۱۹۲۳ء) فرانسیسی بحریہ کا افسر تھا - اس نے مشرق ممالک کا سفر کیا اور ترکیہ، مصر، بلقان، مراکش، ایران، ہندوستان اور جاپان تک پہنچا - اس نے ان ممالک کی زندگی سے متاثر ہو کر ناولیں بھی لکھی ہیں، سفرنامے بھی۔ ناولوں میں سفرنامے کا انداز ہے اور سفرناموں میں ناول کا رنگ - ترکیہ میں اسے ایک مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی لیکن اسے رفیق حیات نہ بنا سکا - اس ناکام محبت کا اثر لوتی کی ادبی نگارشات میں اکثر جگہ نمایاں ہے - ترکیہ میں اس ناکام محبت کے پس منظر میں اس نے اپنی مشہور ناول 'آذیادے' لکھی۔ اس کے بعد کئی ناولوں میں سیاحوں کی ناکام محبت کا ذکر ہے - لوتی کو اس کی ادبی خدمات کی بنا پر فرانس کی اکادمی کا رکن منتخب کیا گیا جو فرانس کے دانشوروں کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے -

لوتی ۱۹۰۰ء میں ہندوستان آیا - ہندوستان کے سفر کے بارے میں اس کی کتاب کا نام 'لیند ساں لیزانگلے' (L'Inde Sans Les Anglais) ہے، یعنی 'ہندوستان انگریزوں کے بغیر'—اس عجیب سے نام کی وجہ یہ ہے کہ لوتی نے ہندوستان میں زیادہ تر دیسی ریاستوں میں قیام کیا۔ برطانوی ہندوستان سے گزرا لیکن کہیں زیادہ قیام نہیں کیا - چناں چہ اس نے حیدر آباد، ٹراونکور، جودھ پور اور دیگر ریاستوں کے بارے میں خاصی تفصیل سے لکھا ہے -

لوتی کو اسلامی معاشرت اور فن تعمیر سے خاص دلچسپی تھی۔ اس نے ہندوستان آ کر اسلامی اور ہندو فن تعمیر کے شاہکار دیکھے۔ وہ دونوں کا مداح ہے لیکن ایک کو دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں ہندو فن تعمیر کے بہترین نمونوں کو دیکھنے کے بعد شمالی ہند میں آگرے کے قریب پہنچا ہے تو مذکورہ بالا کتاب میں لکھتا ہے:

"اور (میری طرح) برہمنی ہندوستان سے آنے والا سب سے پہلے جس چیز سے متاثر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مذہبی عمارتوں کے فن تعمیر کا تصور یہاں بالکل جداگانہ ہے۔ پگوڈا کی جگہ یہاں مسجدیں ہیں۔ تعمیر میں وسعت کے تصور کی جگہ نزاکت اور صحت نے لے لی ہے۔ پران میں دیوتاؤں کے تصور سے متاثر ہو کر جو مہیب شکلیں اور بت نظر آتے تھے، وہ آگرے کی سرزمین میں نظر نہیں آتے۔ یہاں کی عمارتوں میں سفید سنگ مرمر میں نہایت خوبصورت اور نازک نقوش نظر آتے ہیں۔
عظیم مغل بادشاہ! جن کی عظمت داستان پارینہ کا حصہ ہو گئی۔
ان مغل بادشاہوں نے یہ عمارتیں بنوائی تھیں۔

مغل جو اس عظیم‌الشان مملکت کے فرماں‌روا
تھے جس کی مثال تاریخ عالم میں شاید ہی
کہیں ملے۔" (صفحہ ۳۷۰)

لوتی آگرے پہنچ کر پہلے قلعہ آگرہ کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کرتا ہے۔ تاج محل دیکھ کر لکھتا ہے:

"تاج جسے ساری دنیا نے دیکھا ہے اور
تسلیم کیا ہے کہ تاج دنیا کے عجائبات میں
سے ایک ہے۔"

اس کے بعد تاج محل کے فن تعمیر پر سیر حاصل تبصرہ کرتا ہے اور آخر میں لکھتا ہے:

"جدید مغربی آرٹ کم و بیش اُس حسن
کاری اور آرائش کے فن کی نقل ہے جو
سترھویں صدی میں ہندوستان میں پروان چڑھا۔"
(صفحہ ۳۷۹)

مغل تہذیب و تمدن کے بارے میں فرانس کی اکادمی کے ممتاز رکن لوتی کی یہ رائے بہت اہم ہے اور ہمیں یاد دلاتی ہے کہ مغرب نے مشرق سے جو کچھ سیکھا اُسے مغرب کے دانشور ابھی بھولے نہیں۔

اٹھارویں صدی کے پیرس کی
ایک انجمن‌آرا خاتون

فرانس کی تاریخ میں سیاسیات ، علوم و فنون ، ثقافت اور ہر اہم شعبے میں خواتین نے بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔ ان میں سے بعض خواتین نے محض اپنے حسن و جمال اور عشوہ طرازی کی بنا پر بادشاہوں اور ارباب حکومت کے دلوں کو مسخر کیا اور ملک میں اثر و رسوخ حاصل کیا ۔ لیکن ایسی خواتین کی بھی کمی نہیں جنھوں نے اپنی فطری ذہانت ، علم دوستی اور خوش ذوق کی وجہ سے ارباب علم و فن کو متاثر کیا اور ثقافت کی گراں بہا خدمات انجام دیں ۔ ان میں سے بعض خود عالم یا ادیب یا فن‌کار تھیں اور بعض عالموں ، ادیبوں اور فن کاروں کی دوست اور ہمدرد تھیں ، اور ان کی امداد کو اپنی زندگی کا نصب‌العین سمجھتی تھیں ۔ من‌جملہ اور خدمات کے یہ خواتین دانش‌وروں کے مل بیٹھنے کے لیے مخصوص محفلیں ترتیب دیتی تھیں ۔ ان محفلوں نے آہستہ آہستہ فرانسیسی

ثقافت میں ایک 'ادارہ' کی حیثیت حاصل کر لی اور ادب کے بعض شہ پارے ان محفلوں کی فضا میں تخلیق ہوئے۔ جن خواتین نے یہ ادبی اور علمی فضا پیدا کی ان میں ایک خاتون مادام ژفریں (Madame Geoffrin) بھی تھی۔

مادام ژفرین کا نام شادی سے پہلے "ماری تیرس رووے" تھا۔ وہ ۱۶۹۹ع میں پیرس میں ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئی۔ بچپن میں اس کے والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اس کی نانی نے اس کی پرورش کی۔ اور چوں کہ وہ خود ایک رئیس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اس لیے اس نے ماری تیرس کی تربیت بھی اسی رکھ رکھاؤ سے کی اور اسے بچپنے میں اُن اخلاق، آداب اور روایات سے روشناس کرا دیا جو اٹھارھویں صدی کی فرانسیسی معاشرت کا حصہ تھیں۔

ماری کی شادی چودہ سال کی عمر میں پیر فرانسو ژفریں سے کر دی گئی۔ اور اب ماری مادام ژفرین بن گئی۔ موسیو ژفریں کی عمر شادی کے وقت پینتالیس سال تھی؛ لیکن عمر کے اس تفاوت سے مادام ژفریں پر کوئی اثر نہیں ہوا؛ وہ ساری عمر ایک نیک دل شریف بیوی رہی۔

مادام ژفریں کی شہرت کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوا جب اس کی عمر چالیس سال کی تھی۔ یہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط کا زمانہ تھا؛ اس دور میں فرانس کے

دانشوروں، فلسفیوں ، شاعروں ، ادیبوں کی سرگرمیاں شباب پر تھیں ۔ یہ دور فرانسیسی ادب میں فلسفیانہ اور کلاسیکی ادب کے ارتقا کا دور تھا ۔ اور اس کے مقابل رومانی ادب کی تحریک بھی رد عمل کے طور پر شروع ہو چکی تھی ۔ یہ انقلاب فرانس سے ذرا پہلے کا زمانہ تھا جس میں روسو ، والتیر، دیدیرو ،بفوں، مانتسکو اور 'انسائکلوپیڈیا کی لڑائی ' کے دانش ور مثلاً دالمبر ، مارمونتیل وغیرہ کی نگارشات اورہنگامے منظرعام پرآئے ۔'انسائکلوپیڈیا کی لڑائی' فرانسیسی علم و ادب کی تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ باب ہے ، جس کا ذکر نہایت مختصر طور پر میں آگے چل کر کروں گا ۔

دانش وروں کے دیوان خانے :

اس دور کے دانش ور اور ادیب صرف تنہائی میں بیٹھ کر سوچنے اور لکھنے کے قائل نہیں تھے ۔ ان میں سے بیش تر قہوہ خانے میں بیٹھ کر علمی اور ادبی بحثیں کیا کرتے تھے اور بعض مخصوص علمی محفلوں اور مجلسوں کو گرمایا کرتے تھے ۔ یہ مخصوص محفلیں چند با مذاق ، زندہ دل اور علم دوست خواتین کے دیوان خانوں میں منعقد ہوتی تھیں اور اس طرح ان محفلوں کو 'سالوں' (Salon) کہا جانے لگا ۔ سالوں کی اصطلاح فرانسیسی ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے ۔ سالوں کی یہ

محفلیں چند متمول اور با اثر خواتین ترتیب دیتی تھیں ۔ ان محفلوں میں جہاں اہل علم ، اہل ادب اور فن کاروں کو دعوت دی جاتی تھی ، وہاں علم دوست ، سخن فہم اور دیگر بامذاق خواتین و حضرات بھی بلائے جاتے تھے ۔ مقصد یہ تھا کہ ایک طرف تو دانشوروں کو ایک دوسرے سے ملنے ، گفتگو اور بحث کرنے کا موقع ملے اور دوسری طرف یہ کہ ان کی گفتگو جہاں تک ممکن ہو، اوسط درجے کے تعلیم یافتہ اور بامذاق حضرات کی سطح سے بہت زیادہ بلند نہ ہونے پائے تاکہ دانشور اور ادیب اپنے عوام اور قاری سے قریب رہیں اور اس طرح ادب زندگی کے قریب رہے ، اس سے ماورا نہ ہو جائے ۔ ان محفلوں میں خشک علمی اور ادبی مباحثے بھی ہوتے تھے اور ہلکی پھلکی گپ بازی بھی ۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ فلسفہ ، تاریخ ، سیاسیات معاشیات ، ادب ، سائنس وغیرہ کے کسی مسئلے پر بحث شروع ہوئی ؛ کچھ دیر کے بعد یہ بحث عام سطح پر آ گئی اور مذاق اور نوک جھونک ہوتی رہی ۔ پھر گفتگو کا معیار اور گرا اور پھکڑ بازی شروع ہو گئی ۔ بانی محفل خاتون نے محفل میں نظم و ضبط قائم کیا ، گفتگو کا معیار پھر آہستہ آہستہ بلند ہوا اور اپنی سطح پر آ گیا ۔ غرض ان محفلوں میں باذوق عوام اہل علم سے بہت کچھ سیکھتے تھے ۔ اور اہل علم کو اپنے خشک قسم کے مشاغل کے بعد

ایک پرلطف صحبت میں وقت گزارنے کا موقع مل جاتا تھا جہاں وہ عوام سے قریب ہو جاتے تھے ۔

اسی قسم کا ایک 'سالون' مادام ژفریں نے بھی قائم کرنا چاہا جب کہ اس کی عمر چالیس سال کی تھی ۔ اس وقت پیرس میں چند دیگر صاحب ذوق خواتین نے بھی 'سالون' قائم کر رکھے تھے جو پیرس کی ادبی اور معاشرتی زندگی میں بہت شہرت حاصل کر چکے تھے ۔ مقابلہ سخت تھا لیکن مادام ژفریں نے اپنی خدا داد ذہانت اور خوش ذوقی سے مشکلات پر جلد قابو پا لیا ۔ پہلے تو اس نے ان خواتین سے مراسم پیدا کیے جن کے 'سالون' بہت مشہور تھے ۔ اس زمانے میں مادام پوپے لینٹر سے اس کی دوستی زیادہ آگے نہیں بڑھی لیکن مادام ژفریں اور مادام تن سیں جلد باہم شیر و شکر ہوگئیں ۔ اور جب ۱۷۴۹ع میں مادام تن سیں کا انتقال ہوا اور اس کے 'سالون' کی محفل برہم ہوئی تو وہ محفل مادام ژفریں کے 'سالون' کی شکل میں دوبارہ گرم ہو گئی اور اس طرح پیرس کے مشہور بورژوا علاقے رو سیں اونورے میں مادام ژفریں کا مکان فلسفیوں ، ادیبوں اور فن کاروں کا اہم مرکز بن گیا ۔

پہلے پہل تو مادام ژفریں کے شوہر نے اپنی بیوی کے اس نئے مشغلے کو نا پسند کیا ؛ لیکن جلد ہی وہ

اپنی شریک حیات کا ہم خیال ہو گیا اور 'سالون' کی محفلوں کے اہتمام میں پورے جوش و خروش سے حصہ لینے لگا ۔ مادام ژفریں کی جدت پسند طبیعت نے اپنے 'سالون' کے لائحۂ عمل میں دو اہم تبدیلیاں کیں ۔ پیرس کے دوسرے 'سالون' میں مہمانوں کو رات کے کھانے پر بلایا جاتا تھا ، اور جب تک کھانا ختم ہو ، رات زیادہ ہو جاتی تھی اور مہمانوں کو گفتگو کے لیے کافی وقت نہیں ملتا تھا ۔ مادام ژفریں نے یہ جدت کی کہ مہمانوں کو کھانے کے لیے رات کے بجائے بعد دوپہر میں آنے کی دعوت دی تاکہ شام تک کھانے سے فارغ ہونے کے بعد باتیں کرنے کے لیے زیادہ وقت ملے اور رات کو زیادہ دیر سے گھر واپس نہ جائیں ۔ دوسری اور زیادہ اہم جدت مادام ژفریں نے یہ کی کہ اپنے مہمانوں کو دو بڑے ممیز حصوں میں تقسیم کیا ۔ ایک گروہ فن‌کاروں کا اور ایک گروہ لکھنے والوں اور مفکروں کا ۔ وہ ہر ہفتے پیر کے روز فن کاروں کی میزبانی کرتی تھی اور بدھ کے روز پیرس کے اہل قلم اور مفکرین کی دعوت ہوتی تھی ۔

ان محفلوں میں مادام ژفریں کا کردار اہم اور بعض اوقات نازک ہوتا تھا ۔ وہ بذلہ سنجی ، مزاح ، نوک جھونک ، فقرے بازی کی حوصلہ افزائی کرتی تھی ۔ اور خود حصہ لیتی تھی ۔ لیکن محفل کے مذاق کا

معیار پست نہیں ہونے دیتی تھی - جب کبھی محفل میں پھکڑپن شروع ہوتا تو مادام کا ایک جملہ: "بس یہ کافی ہے" سب کو خاموش کر دیتا تھا - وہ ہر قسم کی بدمذاقی کے خلاف تھی - ایک مرتبہ ایک مشہور رئیس کھانے کی میز پر ایک ضرورت سے زیادہ طویل کہانی سنا رہا تھا جس سے تمام سامعین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا - رئیس نے ایک اور حرکت یہ کی کہ میز پر رکھے ہوئے گوشت کو کاٹنے کے لیے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا چاقو نکالا - مادام ژفریں نے کہا: "عالی جاہ! اس محفل میں شامل ہونے کے لیے لمبا چاقو اور چھوٹی کہانیاں ضروری ہیں -"

مادام ژفریں کے 'سالون' میں جو فلسفی اور ادیب آتے تھے ان میں سے زیادہ تر ترقی پسند اور باغی قسم کے دانشور ہوتے تھے - ان میں ایک بڑی تعداد ان دانشوروں کی تھی جو 'انسائیکلوپیڈیا کی لڑائی' کے مرد میدان تھے - یہ لڑائی بھی فرانس کے علم و ادب کی تاریخ میں بہت دل چسپ ہے - اس کا مختصر حال یہ ہے -

انسائیکلو پیڈیا کی لڑائی:

ہوا یوں کہ ۱۷۴۶ع میں فرانس کے ایک ناشر

نے طے کیا کہ ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب کی جائے ۔ یہ کام فرانس کے ایک مشہور دانشور دیدیرو کے سپرد کیا گیا ۔ دیدیرو بلا کا ذہین انسان تھا ۔ وہ تقریباً ہر موضوع پر لکھ سکتا تھا ۔ اس نے اپنے ساتھ ملک کے مشہور ریاضی اور سائنس دان دالمبر اور دیگر دانش وروں کو بھی شریک کار بنا لیا اور کام شروع کر دیا ۔ چناں چہ ۱۷۵۱ع میں انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد شائع ہوئی ۔ اس جلد میں لکھنے والوں نے اہم مسائل پر خالص علمی اور سائنٹفک انداز میں معلومات فراہم کی تھیں ۔ ان میں سے بعض باتیں ایسی کہی گئی تھیں جو اس زمانے کے مذہبی رہنماؤں کے عقائد کے خلاف تھیں ۔ چناں چہ انھوں نے اس کتاب کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا ۔ اخباروں میں کالم لکھے گئے ، کتابیں اور کتابچے شائع ہوئے ، حکومت سے احتجاج کیا گیا ۔ اسی عرصے میں دوسری جلد بھی شائع ہو گئی اور مزید ہنگامہ برپا ہوا ۔ آخر کار ۱۷۵۲ع میں حکومت نے دونوں جلدیں ضبط کر لیں ۔

لیکن انسائیکلو پیڈیا کے مصنفین نے ہمت نہ ہاری ۔ ان کی حقیقت پسندی ، علمی تبحر اور جرأت کی وجہ سے ان کے بہت سے ہمدرد پیدا ہو گئے ۔ شہنشاہ فرانس کی منظورنظر مادام پامپادور نے بھی ان مصنفین کی حمایت کی ۔ آخر کار حالات بہتر ہوئے اور ۱۷۵۳ع سے ۱۷۵۶ع

تک اس کتاب کی چار اور جلدیں شائع ہو گئیں ۔ لیکن اس کے دو ہی سال بعد انسائیکلو پیڈیا کی ایک اور جلد کی اشاعت پر پھر ہنگامہ ہو گیا کیوں کہ بعض مضامین میں 'مادیت' کی تلقین کا الزام لگایا گیا اور اسے مذہبی تعلیمات کے خلاف قرار دیا گیا ۔ ۱۷۵۸ء میں کتاب کے نسخے نذر آتش کیے گئے ۔ ۱۷۵۹ء میں حکومت نے کتاب پر پھر پابندی لگائی ۔ اسی سال پاپائے روم نے انسائیکلو پیڈیا کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا ۔

آخر کار دیدیرو نے بہت کوشش کے بعد مخالف فریقین کو راضی کیا کہ کتاب کو مکمل ہونے دیا جائے ۔ چناں چہ ۱۷۷۲ء میں انسائیکلو پیڈیا کی سترہ جلدوں کی تکمیل ہو گئی ، اور اس کے بعد انسائیکلو پیڈیا کی جنگ کا مسئلہ ختم ہو گیا ۔

انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت عہد آفریں ہے ۔ اس کتاب نے فرانسیسی عوام میں علمی تحقیق کا ذوق پیدا کیا اور ترقی پسندی کا راستہ دکھایا اور یہ بھی دکھا دیا کہ اہل دانش اور اہل قلم مخالفتوں اور حوصلہ شکنیوں کے باوجود دھن کے پکے ہوتے ہیں ۔

انسائیکلو پیڈیا کی لڑائی کے سورماؤں کی ہمت بندھانے میں مادام ژفرین اور اس کے 'سالوں' کا بڑا حصہ ہے ۔ 'سالوں' کی محفلوں میں انسائیکلو پیڈیا کے مصنفین

کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی ۔ خود مادام ژفریں ان کی ہمت بندھاتی تھی ۔ اور اگر حکومت کی داروگیر سے کوئی مصنف مالی مشکلات میں پھنس جاتا تو مادام ژفریں اس کی مالی امداد بھی کرتی تھی ۔ ان مصنفین کے اس دور زندگی کی داستان بھی دلچسپ ہے ۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں ۔

انسائیکلوپیڈیا کے مصنفین میں سے ایک ادیب مارموں‌تیل تھا ۔ کتاب کی تصنیف کے وقت اس کی عمر صرف تیئیس سال کی تھی ۔ وہ ایک دیہاتی نوجوان تھا جسے والتیر دیہات سے پیرس لایا ۔ مارموں‌تیل بلا کا ذہین نوجوان تھا ۔ مادام ژفریں نے اپنے مکان ہی میں ایک کمرہ اسے رہائش کے لیے دے رکھا تھا ۔ مادام ژفریں کے مشورے سے اس نے ایک نہایت باغیانہ اور طنزیہ ڈراما 'Belisaire' لکھا ۔ جب یہ ڈراما شائع ہوا تو رجعت پسند حلقوں میں ہنگامہ برپا ہو گیا اور اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کے خلاف تحریک شروع ہوگئی ۔ آخر حکومت نے نہ صرف اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے پر پابندی لگا دی بلکہ مارموں‌تیل پر مقدمہ چلایا اور اسے تین ماہ قید کی سزا دی گئی ۔ اس پر بالائے ستم یہ کہ اس کی کتاب اس کے سامنے بر سر عام شاہی جلاد کے ہاتھوں نذر آتش کرائی گئی ۔ اور پھر مستزاد یہ کہ عدالت کے فیصلے کی نقل ملزم کے

مکان یعنی مادام ژفراں کے مکان کی دیوار پر چسپاں کر دی گئی ۔ مادام ژفریں لاکھ ترقی پسند سہی لیکن تھی تو ایک متمول بورژوا خاندان کی فرد ! اسے اپنی یہ بے عزتی بہت شاق گزری ۔ چناں چہ جب مارموں تیل تین ماہ کی سزا کاٹ کر گھر واپس آیا تو مادام ژفریں نے ذرا سرد مہری سے اس کی پزیرائی کی ۔ مارموں تیل بھی بہت حساس تھا ، وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ زور سے بند کر دیا ۔ اب مادام کو اپنے طرز عمل پر شرمندگی ہوئی ۔ اس نے دروازہ کھولنے کو کہا ؛ مارموں تیل نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ کھانے کا وقت آیا تو مادام نے کھانے پر اصرار کیا ۔ مارموں تیل نے بالکل خاموشی اختیار کی اور دروازہ نہیں کھولا ۔ دوسرے دن صبح کو مادام نے اس کی بہت منت سماجت کی اور معافی مانگی ۔ آخر کار مارموں تیل نے اسے معاف کر دیا ۔ مادام کمرے میں داخل ہوئی اور پھر وہ ہمیشہ کی طرح دوست ہوگئے ۔ اور پھر اس ناخوش گوار واقعے کا ذکر دونوں نے کبھی نہیں کیا ۔

۱۷۴۹ع میں موسیو ژفریں کا انتقال ہو گیا ۔ مادام ژفریں اب بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکی تھی ۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کے ذوق اور ذہانت میں اور زیادہ گہرائی اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی تھی ۔ اب اس کی شہرت

پیرس اور فرانس ہی میں نہیں بلکہ یورپ کے دیگر ممالک میں بھی پھیل چکی تھی ۔ نہ صرف پیرس کے امرا اور دانشور اس کے 'سالوں' میں بلائے جانے کو فخر سمجھتے تھے بلکہ دوسرے ممالک کے سر برآوردہ لوگ اور والیان ملک جب بھی پیرس آتے تھے تو ان کی آرزو ہوتی تھی کہ مادام ژفریں کی محفل میں شریک ہوں ۔ وہ پیرس سے جانے کے بعد ان محفلوں کی یاد کو تا زیست حرز جان بنائے رکھتے تھے۔ اس طرح مادام ژفریں نے یورپ کی سیاست میں بھی ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا ۔ اور بعض ممالک کے فرماں روا اور سفیر اہم معاملات میں مادام ژفریں سے مشورے کرتے تھے اور اس کی مدد چاہتے تھے ۔

غلام نرگس مست تو تاجدارانند :

ان پرستاروں میں سے پولینڈ کا فرماں روا پونیاتوسکی بھی تھا ۔ پونیاتوسکی مادام ژفریں کی ذہانت ، انداز گفتگو اور سلیقہ‌مندی کا مدتوں پرستار رہا ۔ وہ مادام ژفریں کو 'میری روحانی بیوی' کہا کرتے تھے ۔ پونیاتوسکی مادام سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنے شہزادے ستانسلاس پونیاتوسکی کو مادام کے پاس بھیجا تا کہ وہ مادام سے آداب محفل ، خوش ذوقی اور نفاست سیکھے ۔ اور جب ۱۷۵۳ء میں شہزادہ اپنے والد کی 'روحانی بیوی' کے

پاس پیرس آیا تو مادام ژفریں نے شفقت مادری کا حق ادا
کیا ۔ شہزادہ ایک یارباش ، باغ و بہار قسم کا نوجوان تھا
اور اس کے ساتھ ساتھ شاہ خرچ بھی ۔ پیرس کی رومانی زندگی
میں شہزادہ جلد ہی کھل کھیلا اور باپ کے بھیجے ہوئے
جیب خرچ سے زیادہ خرچ کرنے لگا ۔ مادام ژفریں نے
اسے بے راہ روی سے روکنے کی حتی‌السقدور کوشش کی ۔
ایک دفعہ شہزادہ ایک بہت بڑی رقم جوئے میں ہار گیا ۔
یہی نہیں بلکہ اس سے بڑی رقم کا مقروض ہو کر قمار خانے
سے واپس آیا ۔ یہ رقم چوبیس گھنٹے کے اندر واپس کرنی
تھی ۔ شہ زادہ سخت پریشان تھا ۔ باپ کو رقم کے لیے
لکھنے کی جرأت نہ تھی ، صرف مادام ہی اس کی آخری
اُمید تھی ۔ مادام نے اصرار کیا کہ وہ پہلے ساری رام کہانی
صحیح صحیح بیان کرے ۔ شہزادے نے نہایت پشیمانی کے
ساتھ اپنی حماقت شبانہ کا قصہ سنایا ۔ مادام نے قرض چکانے
کا وعدہ کیا لیکن شہزادے کی سزا یہ تجویز کی کہ وہ
چوبیس گھنٹے اس کے مکان میں قید رہے ۔ شہزادے نے اس
سزا کو بصد سپاس منظور کر لیا اور چوبیس گھنٹے روسیں
اونورے میں مادام ژفریں کے مکان میں مقید رہا ۔ اس سزا
خاطر خواہ اثر ہوا ۔ اس کے بعد جب تک شہزادہ پیرس
میں رہا اس قسم کی حرکت نہیں کی ۔ ۱۷۶۴ع میں شہزادہ
پونیاتوسکی پولینڈ کے تخت پر بیٹھا تو مادام ژفریں کی

خوشی کی کوئی حد نہ تھی ۔ اس نے شاہ پولینڈ کو لکھا:

"جب میں سوچتی ہوں کہ میرا پیارا بیٹا جسے میں نے نوجوانی میں دیکھا اور اکثر سرزنش کی ، آج بادشاہ بن گیا ہے تو میرا دماغ چکرا جاتا ہے ..... میری روح ! میں تمھیں پیار کرتی ہوں ..... میرے بیٹے ! میرے بادشاہ ! میرے سوا کون تمھیں اس طرح مخاطب کر سکتا ہے؟"

پونیاتوسکی جو اب پولینڈ کا بادشاہ تھا ، اپنے والد کی 'روحانی بیوی' کو نہیں بھولا ۔ اس نے مادام ژفریں کو پولینڈ آنے کی دعوت دی ۔ مادام ژفریں کا دل پیرس اور اپنا سالوں چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا ، لیکن اپنے 'بیٹے' کے اصرار پر آخرکار پولینڈ جانے پر آمادہ ہو گئی ۔ جب مادام ژفریں وارسا پہنچی تو اس کا 'بیٹا' شاہ پولینڈ اسے لینے آیا ۔ شاہ نے مادام ژفریں کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ۔ لیکن ایک معاملے میں دونوں کا نقطۂ نظر بالکل جدا تھا ۔ مادام ژفریں نے دیکھا کہ بادشاہ کو ان لڑکیوں کی دلداری کا بہت خیال تھا جو اس کے پاس ہر وقت منڈلاتی رہتی تھیں ۔ مادام ژفریں اس ارادے سے آئی تھی کہ وہ اپنے 'بیٹے' کو اس قسم کے اثرات سے بچائے ، اور ایسی فضا پیدا کرے کہ وہ امور مملکت میں

زیادہ دل چسپی لے۔ لیکن مادام ژفریں نے جلد محسوس کرلیا کہ اس کا خیال غلط تھا۔ بادشاہ دل سے اس کی عزت کرتا تھا لیکن وہ نہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے فکر و عمل پر نکتہ چینی کی جائے۔ آخرکار مادام ژفریں دل برداشتہ ہو کر پیرس واپس چلی آئی۔

پیرس واپس آنے پر مادام ژفریں کا 'سالوں' پھر آباد ہو گیا۔ اور فرانس اور یورپ کی ثقافتی زندگی کا ایک اہم ادارہ سمجھا جانے لگا۔ لیکن ضعیفی کی وجہ سے مادام کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ مادام ژفریں نے جلد محسوس کیا کہ اب سفینۂ عمر ساحل بہ کنار ہے اور بادبان باندھے جا رہے ہیں۔ اس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ صاحب فراش ہو گئی اور آخرکار ۶۔ اکتوبر، ۱۷۷۷ء کو ۷۸ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔ 'سالوں' کی محفلیں عرصہ ہوا برہم ہوچکی تھیں، اس لیے مادام ژفریں کی موت کا پیرس میں بہت کم لوگوں کو علم ہوا۔ اس کے جنازے میں معدودے چند افراد تھے جن میں مشہور ریاضی دان اور انسائیکلو پیڈیا کی لڑائی کا سپاہی دالمبر بھی تھا۔ اور اس طرح مادام ژفریں جس نے زندگی بھر سینکڑوں عالموں، ادیبوں، فن کاروں، تاج داروں سے خراج تحسین وصول کیا تھا اور ادب و ثقافت کے فروغ کے لیے انجمن آرائی اور ہنگامہ آرائی کی تھی۔ آخرکار خاموشی سے قبر میں جا سوئی۔ لیکن فرانس کے علم و ادب

کی تاریخ نے اسے بقائے دوام بخش دی[1] ۔

---

(۱) اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتب سے مدد لی گئی ہے :

1. Therese Louis Latour : Salonnieres of the reign of Louis XV.
2. P. Castex et P. Surer : Manuel des Etudes Litteraires Francaises.
3. J. Boudout ; Histoire de la Litterature Francaise.

سارتر کی ایک ناول

فرانسیسی ادیبوں سے اردو دان طبقہ اب خاصا روشناس ہوچکا ہے۔ وکٹر اوگو، بالزاک، فلابیر، ستاندال پروست، ژاں پال سارتر، کاکیتو اور کامیو وغیرہ کے نام سے اب ادب کا ہر طالب علم واقف ہے۔ فرانسیسی ادیبوں نے دنیا کے ہر ملک میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ خصوصاً گزشتہ پچاس سال میں فرانسیسی لکھنے والوں کی تحریریں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے ادب کا حصہ بن چکی ہیں اور اس زمانے میں زبان و ادب کا جتنا چرچا فرانس میں ہے، شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ہو۔ پیرس میں قیام کے دوران میں میں نے دیکھا کہ فرانس کے ادیبوں کو وہاں کے معاشرے میں بہت اہمیت حاصل ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فرانس کے ادیب اپنے ملک کے دانشوروں کی رہ نمائی کر رہے ہیں۔ حکومت کو بھی زبان اور ادب کی ترقی کی ضرورت کا احساس ہے۔ فرانس کی 'اکادمی' دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ ادارہ نہ صرف ادب کی ترقی کے لیے کام کرتا ہے بلکہ زبان کے مسائل

کو سمجھنے اور سلجھانے کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ الفاظ اور محاوروں کے استعمال کے مسائل پر اس ادارے کی نشستوں میں گرما گرم بحثیں ہوتی ہیں اور اکادمی کی رائے قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ایک پروگرام 'پارلے بیاں اکر یوے بیاں' یعنی 'اچھا بولیے اچھا کہیے' نشر ہوتا ہے جس میں زبان و بیان اور الفاظ اور محاوروں کے صحیح استعمال کے بارے میں اہل علم مشورے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ممتاز ادیبوں کو ٹیلی ویژن پر دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے کلام اور اپنے نظریات کو عوام تک پہنچائیں۔ اس طرح ادب کو عوام کے نزدیک سے نزدیک تر لانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور شاید اسی لیے فرانس کے ادب کی مقبولیت اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

اردو میں فرانسیسی ادیبوں کے نظریات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ تنقیدی مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن اصل ادب کو اردو میں منتقل کرنے کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ چند فرانسیسی ناولوں اور افسانوں کے تراجم شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر انگریزی تراجم کے ترجمے ہیں، فرانسیسی متن کے نہیں۔ اس لیے اگر ہم دنیا کے ادب عالیہ سے روشناس ہونا چاہتے ہیں تو بہتر صورت یہ ہے کہ ادبی

شاہکار یا ان کے راست تراجم پڑھیں اور خود ان کے بارے میں رائے قائم کریں اور ساتھ ہی ساتھ تنقیدیں بھی پڑھیں - محض تنقیدیں پڑھ لینے سے کسی ادب کی روح اور مزاج سے واقفیت نہیں ہو سکتی -

حواشی :

ژاں پال سارتر نے 'آزادی کی راہیں' کے سلسلے کے تین ناول لکھے ہیں - ان ناولوں کے نام اور پلاٹ علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن موضوع ایک ہے - اس سلسلے کی پہلی ناول کا نام 'سوجھ بوجھ کی عمر'[1] ہے - اس ناول کا ہیرو ماتیو فلسفے کا پروفیسر ہے - اس کے ایک عورت سے جنسی تعلقات سات سال سے قائم ہیں - اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حاملہ ہے - اسقاط حمل کا انتظام کرنے کے لیے روپے کی ضرورت ہے - اس روپے کی فراہمی کے لیے وہ دو دن سرگرداں رہتا ہے - ان دو دنوں میں ماتیو نے کیا کیا کیا ، کس کس سے ملا ، کیا سوچا اور کیا نتیجہ نکلا ؟ یہ ناول ان دو دنوں کی کہانی ہے لیکن ان اڑتالیس گھنٹوں میں آپ ماتیو کے ساتھ پیرس کی زندگی کا ایک اہم حصہ دیکھ سکتے ہیں -

ماتیو ایک اکیس سالہ لڑکی ایوش سے ہم کلام ہے (یہ ہیروئن نہیں ہے) - یہ دوشیزہ ایک ذہنی الجھن

---

(۱) L'age de Raison.

میں مبتلا ہے جس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی ۔ ماتیو اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنے گاؤں 'لاؤن' چلی جائے جہاں اس کے والدین ہیں ۔ لیکن ایوش پر اٹھتی جوانی ہے ۔ اُس کے نزدیک جوانی کا ہر لمحہ بیش قیمت ہے ۔ وہ پیرس نہیں چھوڑنا چاہتی ۔ وہ لاؤن جانا نہیں چاہتی ۔ وہ ماتیو سے کہتی ہے :

"اے توبہ ہے ! تم سب (مرد) ایسے ہی کہا کرتے ہو ۔ میں چاہتی ہوں کہ تمھیں وہاں دیکھوں[1] ۔ (تم چاہتے ہو کہ میں) دو سال اُس گڑھے میں رہوں ۔ دوسال ! ! تمھاری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں یہ دو سال کھو دوں گی؟ میری صرف ایک ہی عمر ہے ۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم ہمیشہ زندہ رہو گے ۔ تم سمجھتے ہو کہ ایک سال کھو کر دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے (اور اس کی آنکھ میں آنسو آ گئے) ۔ نہیں ، یہ وقت واپس نہیں آسکتا ۔ یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری جوانی قطرہ قطرہ ہو کر بہہ جائے گی ۔ میں ابھی ان لمحات میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ۔ میرے پاس

---

(۱) یعنی تم وہاں جاؤ تو تمھیں معلوم ہو کہ وہ کتنی غیردل چسپ جگہ ہے ۔

زندگی شروع کرنے یا اس کے لیے انتظار کرنے
کا وقت نہیں۔ میں اب بھی خاصی بوڑھی
ہو چکی ہوں۔ میں اکیس سال کی ہوں۔"
(صفحہ ۸۷)

جوانی کے بارے میں کچھ اسی قسم کا خیال ناول میں آگے چل کر بھی بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ناول کے ایک دوسرے کردار 'بوری' کا نظریہ جوانی کے بارے میں یہ ہے:

"بوری کے خیال میں جوانی ایک ایسی جنس
ہے جو مفت مل جاتی ہے۔ جلد ہاتھوں سے
نکل جاتی ہے، اس لیے اس سے جتنا جلد فائدہ
اٹھا لیا جائے، اچھا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی ساتھ یہ جنس ایک نعمت بھی ہے جسے
حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان
خود کو اس کا اہل ثابت کرے۔ اور اس کے
علاوہ جوانی ایک اور چیز بھی ہے، جوانی
ایک جواز بھی ہے۔" (صفحہ ۲۶۶)

مغنیہ کی موت:

یہ 'بوری' صاحب خاصی دل چسپ شخصیت ہیں۔ ان کے تعلقات ایک مغنیہ 'لولا' سے ہیں، جو بوری کو

چاہتی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ بوری کی اُس میں
دل چسپی محبت میں بدل جائے ۔ گزشتہ رات بوری اور
لولا ساتھ ساتھ تھے ؛ صبح کو جب بوری اٹھا تو اس نے
دیکھا کہ لولا بے حس و حرکت بستر پر پڑی ہے ۔ وہ
مر چکی ہے ۔ بوری چپکے سے لولا کے ہاں سے اپنے گھر
آ گیا ، جہاں اس کی بہن ایوش ، جس کا اوپر ذکر کیا گیا
ہے ، اس کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی ۔ وہاں اتفاق سے
ناول کا ہیرو اور بوری کا دوست ماتیو بھی موجود تھا ۔
بوری نے لولا کی موت کی خبر سنائی ۔ ماتیو اور ایوش
پریشان ہوئے ۔ دوران گفتگو میں بوری کو خیال آیا کہ
اس کے کچھ خطوط لولا کے ہاں رہ گئے ہیں ۔ یہ خطوط
بہت اہم تھے ۔ بوری کو پریشانی ہوئی کہ کہیں یہ خطوط
کسی دوسرے کے ہاتھ نہ پڑ جائیں ۔ وہ خود لولا کے ہاں
واپس نہیں جانا چاہتا تھا ۔ مبادا اس عرصے میں پولیس
آچکی ہو اور اسے لولا کے قتل کے الزام میں دھر لیا جائے ،
کیوں کہ بوری اور لولا کے تعلقات کافی مشہور تھے ۔
آخر کار ماتیو ، لولا کے ہاں جا کر خطوط لانے پر آمادہ
ہو جاتا ہے اور لولا کے مکان کی طرف جاتے ہوئے راستے
میں سوچتا ہے :

"لولا مر چکی ہے ۔ وہ اُس کے کمرے میں
داخل ہوگا اور اُس کی بڑی بڑی آنکھیں کھلی

دیکھے گا ۔ اور اس کا سفید جسم ! میں اسے
نہیں دیکھوں گا ۔ اس نے فیصلہ کیا ؛ وہ
مرچکی ہے ۔ اس کے ہوش و حواس ختم ہوچکے
ہیں ۔ لیکن اس کی زندگی ختم نہیں ہوئی ۔
ایک نازک سا پنچھی زندگی کے پنجرے میں
عرصے سے رہتا تھا ، وہ اب اڑ گیا تھا ۔ اس
ننھے پنچھی کی مفارقت میں زندگی صرف ٹھہر
گئی ہے ، جیسے ایک مقام پر تیر رہی ہو ۔
چند آہوں اور چند ناآسودہ آرزوؤں سے بھرپور
زندگی ، کچھ مدھم روشنیوں ، چند بھولے
بسرے چہروں اور چند خوشبوؤں کو لے کر
زندگی تیر رہی ہے ۔ کائنات کے اس سرے پر :
معدوم لیکن پھر بھی موجود[1] ۔ ناقابل فراموش

---

(۱) متن کا لفظی ترجمہ :''قوسین میں''۔ ریاضی میں قوسین یعنی خطوط وحدانی میں جو ہندسے یا علامتیں لکھی جاتی ہیں ، ان کی نوعیت سے اہل نظر واقف ہیں ۔ یہ ہندسے یا علامتیں براہ راست اپنے گرد و پیش پر اثر انداز نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی موجود ہوتی ہیں اور جب ریاضی کے مسئلے کو حل کیا جاتا ہے تو میان قوسین ہندسوں کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں ۔ یہی صورت نثر میں عبارت میان قوسین کی ہے ۔ موت کو ''زندگی میان قوسین'' قرار دینا ایک اچھوتا خیال ہے ۔

اور عیاں جسے فنا نہیں کیا جا سکتا[1] اور جس کے وجود کو کوئی نہیں روک سکتا ۔ زندگی نے اپنا آخری چولا بدلا ہے ۔ اس کا مستقبل اٹل ہے ۔ ماتیو نے سوچا "لولا مر چکی ہے ۔ اس کی زندگی میری طرح ایک طویل 'انتظار' تھی ۔ ایک وقت وہ ہوگا جب (لولا) ایک بادامی رنگ کے بالوں والی الّھڑ لڑکی ہوگی جس نے آرزو کی ہوگی کہ وہ ایک روز ایک بڑی مغنیہ بنے گی ۔ اور پھر ۱۹۲۳ع میں ایک وقت آیا کہ وہ ایک نوجوان مغنیہ بن کر بے تابانہ اسٹیج پر آ گئی ۔ بوری کے لیے اس کی محبت ایک پکی عمر کی عورت کی گہری اور عظیم محبت تھی جس نے اسے اتنا تڑپایا تھا ۔ یہ محبت در اصل پہلے ہی دن سے اس میں موجود تھی ․ ․ ․ ․ ․ ابھی کل رات ہی وہ سوچ رہی تھی کہ میں زندہ رہوں گی اور ایک نہ ایک دن بوری کی محبت مجھے مل جائے گی ۔ وہ کتنے بھرپور لمحے ہوں گے ! کتنے گمبھیر ! محبت کی راتیں جنھیں وہ ابدی سمجھتی تھی

---

(۱) متن "ایک معدنی شے سے زیادہ ناقابل فنا۔"

اصل میں انتظار کی راتیں ہی تو تھیں۔
لیکن اب انتظار کے لیے کچھ نہیں رہا تھا ۔
موت پیچھے ہٹ کر انتظار کے ان لمحات پر
چھا گئی تھی اور ان لمحات کو آگے بڑھنے
سے روک دیا تھا ۔ یہ لمحات ساکت اور خاموش
ہوگئے تھے ؛ بے مقصد اور بے معنی ۔ اب
انتظار کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا ۔ کوئی
کبھی نہ سوچے گا کہ کیا لولا کو پوری کا
پیار مل جائے گا ؟ یہ سوال اب بے معنی
ہوگیا تھا ۔ لولا مرچکی تھی ۔ اب وہ اظہار
ہمدردی ، شفقت اور دعا سب سے بے نیاز
ہوچکی تھی ۔" (صفحہ ۳۰۳ تا ۳۰۵)

شعر گفتن چہ ضرور ؟

ان دنوں دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کے ادب میں شاعری کا بازار مندا پڑتا جا رہا ہے ۔ چناں چہ فرانس میں شاعروں کے چند کلب اب بھی موجود ہیں جن میں بوڑھے شاعر (مرد اور عورت) کبھی کبھی اپنا کلام سناتے ہیں ، لیکن بہ حیثیت مجموعی فرانس میں شاعری کی گرم بازاری ختم ہوتی جا رہی ہے ۔ انگلستان اور جرمنی میں بھی صرف قدیم شعرا سے عقیدت مندی کا اظہار کبھی کبھی کیا جاتا ہے ؛ نئے شعر بہت کم کہے جا رہے ہیں ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ادب کو اب افکار تازہ کی زیادہ ضرورت ہے ۔ افکار تازہ نثر میں یعنی ناول ، افسانہ ، مضمون وغیرہ میں مکمل طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں ۔ اس لیے شاعری کی ضرورت کم محسوس کی جا رہی ہے ۔ اس رجحان کے پیش نظر غالباً یہ ضروری ہے کہ ہم بھی شعر کے نظریے میں ذرا سی تبدیلی کر لیں ۔ ہماری موجودہ اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ زیادہ‌تر جذبات انگیزی ، الفاظ کی خوب صورتی اور خوش آہنگی کا مرہون منت ہے ۔ شعر

کے بعد شعر ، غزلوں کے بعد غزلیں ، نظموں کے بعد نظمیں پڑھتے چلے جائیے ، شعر پڑھنے اور سننے میں مزا ضرور آئے گا لیکن کوئی نئی بات مشکل سے ملے گی ۔ کوئی بڑا تصور بہت کم ملے گا ۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ شعر کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں خیال آفرینی کی طرف زیادہ توجہ دی جائے ۔ شوکت الفاظ ، صنائع بدائع، جذبات انگیزی سب کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن زیادہ اہمیت نئے خیال کو پیش کرنے کی ہے ۔ شعر میں یا تو کوئی نیا خیال پیش کیا جائے یا کم از کم پرانے خیال کو نئے انداز سے پیش کیا جائے ۔ محض شوکت الفاظ اور خوش آہنگی کے سہارے شاعری شاید زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے ۔

اس موقع پر شعر کے متعلق میں اپنے خیالات بھی عرض کر دوں تو بے جا نہ ہوگا ۔ مفصل بحث کا یہ محل نہیں ؛ صرف چند اشاروں ہی پر میں اکتفا کرتا ہوں ۔

میں شعر کو شعر سمجھتا ہوں ۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ ۔ مثلاً شعر فلسفہ نہیں ہوتا ۔ شعر میں بعض اوقات فلسفیانہ مسائل کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے ، لیکن شعر میں فلسفہ بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ فلسفہ یا دیگر علوم کے مسائل زاویۂ نظر اور طریق کار کے اعتبار سے شعر سے مختلف ہیں ۔ کسی علمی نظریے کو بیان کرنے کے لیے

استدلال ضروری ہے اور شعر کی طبع نازک اس بارگراں کی متحمل نہیں ہوسکتی ۔ پھول پھول ہے ، نباتیات کا مسئلہ نہیں ہے ۔ شعر شعر ہے ، علمی بحث نہیں ۔ بعض اہل نظر شعر میں علمی بحثیں تلاش کرتے ہیں ۔ مثلاً غالب کی شاعری اس بے جا تجسس اور بے عمل عقیدت مندی کا شکار رہی ۔ ناقدین نے غالب کے اشعار میں مابعدالطبیعیات ، منطق ، نفسیات حتّٰی کہ فلکیات وغیرہ کے ایسے ایسے نکات نکالے اور ہیگل، برگسوں اور دیگر فلاسفہ سے انھیں اس طرح ٹکرایا کہ توبہ ہی بھلی ۔ بے چارے غالب زندہ ہوتے تو پناہ مانگتے ۔ اس انداز فکر کا دوسرا انتہا پسندانہ رخ یہ ہے کہ قواعد اور عروض وغیرہ کے اوزاروں سے شعر کی 'مرمت' کرنے کی کوشش کی جائے ۔ یہ صورت اگر کسی مبتدی کے نیم پختہ کلام کے لیے اختیار کی جائے تو مناسب ہے ۔ لیکن پختہ کلام اور خوب صورت کلام کے ساتھ یہ ظلم بہت صبر آزما ہوتا ہے ۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک خوب صورت مجسمے کے بارے میں کہا جائے کہ وہ خوب صورت تو ہے لیکن ریاضی اور علم ہندسہ کے فلاں اصول کے لحاظ سے اس میں یہ خامی ہے ، اور پھر ہتھوڑی اور بسولا لے کر اس پر مشق ستم کی جائے ۔ غالب کے کلام پر یہ دونوں ظلم ہو چکے ہیں ۔ شعر کو 'دوربین یا خوردبین سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ۔ شعر نہ تو

لنکا پربت یا کےٹو کی چوٹی ہے اور نہ کوئی جراثیم ۔ شعر کو جب دوربین سے دیکھا جاتا ہے تو مابعدالطبیعیات نفسیات ، اخلاقیات ، ماورائیات باقی رہ جاتی ہیں ، شعر غائب ہو جاتا ہے۔ شعر کو جب خوردبین سے دیکھا جاتا ہے تو عروض ، صرف و نحو ، قواعد ، لسانیات ، صوتیات ، اشتقاقیات باقی رہ جاتے ہیں ، شعر کا قلع قمع ہو جاتا ہے ۔ اس لیے میں شعر کو دوربین یا خوردبین کی بجائے چشم حقیقت بیں سے دیکھنے کا زیادہ قائل ہوں ۔

شعر اگر نظر میں در آئے ، مذاق سلیم قبول کر لے اور وہ دل میں اُتر جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا حق ادا ہوگیا ۔ لیکن اگر کوئی صاحب شعر کے لیے دوربین یا خوردبین استعمال کریں تو میں انھیں منع کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا ، بالکل اسی طرح جیسے کہ اگر ایک ماہر نباتیات پھول کو ریزہ ریزہ کرکے خوردبین سے دیکھتا ہے تو مجھے اسے روکنے کا حق نہیں ہے ۔ اس نے کیا کھویا کیا پایا ، یہ وہ جانے لیکن جو کچھ اس نے خوردبین سے دیکھا ، وہ پھول نہیں تھا ۔

پروفیسر آربری سے ایک ملاقات

مشہور مستشرق پروفیسر آربری سے میری ملاقات کا انتظام برٹش کونسل لندن کی معرفت ہوا۔ لندن میں غیر معمولی کہر تھا، اس لیے میری ٹرین نصف گھنٹہ دیر سے کیمبرج پہنچی۔ میں ٹیکسی لے کر سیدھا پمبروک کالج گیا۔ پروفیسر آربری نے نہایت خندہ پیشانی سے میری پزیرائی کی اور مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ میں نے تاخیر سے آنے کی معذرت کی۔ آربری صاحب نے کہا کہ ایسے موسم میں تو ممکن تھا کہ آپ اور تاخیر سے آتے بلکہ بالکل نہ آتے۔ خیر آپ آ تو گئے، اچھا ہوا۔

پروفیسر آربری نے پہلے میرے بارے میں سوالات کیے، میں نے عرض کیا کہ میں محض ایک سرکاری عہدیدار ہوں، اہل علم میں سے نہیں؛ البتہ طالب علم ضرور ہوں۔ اپنے ملک کی انتظامیہ سے میرا تعلق ہے لیکن ادبیات سے شوق ہے۔ یہی شوق آپ تک کھینچ کر لایا۔ اس کے بعد میں نے آربری صاحب سے چند سوالات کیے لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنے سوالات اور آربری صاحب کے

جوابات کا ذکر کروں ، آربری صاحب کے بارے میں چند باتیں اُن حضرات کے لیے عرض کر دینا ہوں جنھیں آربری صاحب کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ۔

پروفیسر آرتھر جان آربری ایم ۔ اے ۔ لٹ ۔ ڈی ۔ ایف ۔ بی ۔ اے ۔ کیمبرج یونیورسٹی میں ۱۹۴۷ع سے عربی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں ۔ موصوف ۱۹۰۵ع میں پیدا ہوئے ، کیمبرج یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس کلاسیکل ٹرائی پاس کلاسیکل اور مشرق علوم میں کیا ۔ ۱۹۳۱ع میں پمبروک کالج کیمبرج کے فیلو مقرر ہوئے ۔ ۱۹۳۲ع میں قاہرہ یونیورسٹی میں علوم مشرق کے شعبے سے متعلق رہے ۔ دو سال بعد انڈیا آفس کے کتب خانے سے منسلک ہوئے ۔ دوران جنگ برطانوی دفتر جنگ میں کام کیا ۔ جنگ کے بعد ۱۹۴۶ع تک لندن یونیورسٹی میں عربی اور فارسی ادبیات کے پروفیسر رہے اور اس کے بعد کیمبرج آ گئے ۔ موصوف مصر ، ایران اور دمشق کی اکادمی کے ممبر ہیں اور یونسکو کے اس شعبے کے نائب صدر ہیں جس میں مختلف زبانوں کے تراجم کا انتظام کیا جاتا ہے ۔ پروفیسر آربری پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ان میں سے بیشتر اعلیٰ تحقیق کے شہ پارے ہیں ۔

میں نے پروفیسر آربری سے دریافت کیا کہ ان کی رائے میں کیا مغربی ملکوں میں مشرقی زبانوں اور علوم

میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے (ممکن ہے صحیح نہ ہو) کہ یورپ میں مشرقی زبانوں کے تعلیمی اداروں میں خاطر خواہ رابطہ نہیں ہے ۔ آربری صاحب نے وضاحت چاہی ۔ میں نے کہا کہ مثلاً پیرس کے تعلیمی ادارے کو اکثر صورتوں میں معلوم نہیں ہوتا کہ لندن میں کن مسائل پر تحقیقی کام کیا جا رہا ہے ، یا ممکن ہے کیمبرج میں کوئی طالب علم اسی موضوع پر کام کر رہا ہو جس پر نیپلز کے مشرقی علوم کے ادارے میں کام کیا جا چکا ہو ۔ آربری صاحب نے اتفاق کیا اور کہا کہ ہاں ایسا ہوتا ہے، اور یہ افسوس ناک ہے ؛ پھر اس کے لیے آپ کے پاس کیا تجویز ہے ؟

میں نے کہا کہ معلومات کے تبادلے کی کوئی باقاعدہ صورت اختیار کی جانی چاہیے ۔ مثلاً یہ کہ کوئی ایسا جریدہ سہ ماہی ، شش ماہی یا سالانہ شائع کیا جائے جس میں مشرقی علوم کے تمام ادارے اپنے اپنے تحقیقی کاموں کے بارے میں معلومات شائع کریں ۔ اس طرح ہر ادارے کو معلوم ہوتا رہے گا کہ دوسرے اداروں میں کن موضوعات پر کام ہو رہا ہے ۔

آربری صاحب مسکرائے ؛ کہنے لگے کہ تجویز معقول ہے اور مفید بھی ، لیکن اس کا ایک پہلو دلچسپ ہے جس سے ممکن ہے بعد میں مشکل پیدا ہو جائے ۔ بعض ممالک

اس قسم کی معلومات سے غلط فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے ایک ملک کا ذکر کیا اور کہا کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ میرا کوئی طالب علم کسی مخطوطے پر کام کر رہا ہے، کسی ملک کو معلوم ہوگیا کہ فلاں مخطوطہ فلاں جگہ موجود ہے۔ چناں چہ اس ملک کے کتب خانے نے نہایت معصومیت سے ہمیں لکھا کہ ہمیں فلاں مخطوطے کی مائکرو فلم چاہیے۔ ہم اخلاقاً انکار نہیں کرتے۔ اس طرح اس مخطوطے کی نقل دوسرے ملک میں گئی اور کسی صاحب نے اسے کچا پکا ایڈٹ کر کے شائع کر دیا اور اس طرح ہمارے طالب علم کی محنت بے کار ہو گئی۔

میں نے کہا یہ تو تحقیق میں اخلاقیات کا مسئلہ ہے اور افسوس ہے کہ اس اخلاقی اصول سے انحراف کیا جاتا ہے۔ بہرحال اگر ایسا ہے تو پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کم از کم تحقیق مکمل ہونے کے بعد مقالے کی تلخیص یا موضوع جریدے میں شائع کر دیا جائے تاکہ دوسرے اداروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان موضوعات پر کام ہو چکا ہے۔ پروفیسر آربری نے کہا کہ ہاں یہ ہو سکتا ہے اور اس سے اساتذہ اور محققین کو موضوعات کے انتخاب میں مدد ملے گی۔ یوں ایک رسالہ برطانوی مستشرقین کی انجمن کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ لیکن اگر دنیا کے تمام مشرقی علوم کے اداروں میں اس طرح

باقاعدہ رابطے اور معلومات کے تبادلے کا انتظام ہو جائے تو نہایت مفید ہوگا ۔

پروفیسر آربری نے کہا کہ مشرق زبانوں کے علاوہ اسلامیات کے موضوع پر بھی اس قسم کی اسکیم کو رو بہ عمل لانا بہت مفید ہوگا ۔ مختلف ممالک میں اسلامی موضوعات پر کام کیا جا رہا ہے ۔ بعض جرائد میں مضامین بھی شائع ہوتے ہیں ۔ لیکن بہتر ہوگا کہ مختلف ممالک میں اسلامی موضوعات پر تحقیق کے بارے میں معلومات کے تبادلے کے لیے آپ کی تجویز کی روشنی میں ایک منصوبہ بنایا جائے ۔ اس سلسلے میں پاکستان کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اور وہاں اگر کوئی ادارہ اس کام کا بیڑا اٹھائے تو مناسب ہوگا ۔

میں نے کہا کہ اسلامیات میرا مضمون نہیں ہے ، لیکن میں یہ تجویز آپ کی رائے کے ساتھ اپنے ملک کے اہل علم کے سامنے پیش کروں گا ۔ البتہ جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے ، میں وطن واپس جا کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا ۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے پروفیسر آربری سے کہا کہ جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ میں صرف ایک انتظامیہ کا عہدیدار ہوں ، علمی مسائل میں میرے معروضات اگر بے جا تھے تو میں معافی کا خواست گار

ہوں ۔ آربری صاحب نے کہا کہ خود میرا تعلق کسی زمانے میں انتظامیہ سے رہ چکا ہے ۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں اور آپ کے ملک میں بھی انتظامیہ اور سول سروس کے عہدیداروں میں سے ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو علم دوست بھی تھے ۔ ان میں سے کئی مصنف بھی ہوئے ہیں ۔ علم دوستی کی روایت ہمارے اور آپ کے ملک کے عہدہ داروں میں موجود ہے ۔ آپ اسے برقرار رکھیے ۔ پھر کہنے لگے ، اور اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے ؛ علمی مسائل کا جائزہ لیتے وقت بعض ایسے پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن پر خالص علمی انسان کے مقابلے میں ایک انتظامیہ سے تعلق رکھنے والا شخص بہتر سوچ سکتا ہے ۔ علمی کاموں میں تنظیم کی بھی ضرورت ہے اور اس طرح انتظامی صلاحیتیں بروئے کار لائی جا سکتی ہیں ۔ اس لیے آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں اور جو کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے کسی معذرت کی ضرورت نہیں ۔ آپ اگر مجھے اپنی مساعی سے باخبر رکھیں تو مجھے خوشی ہوگی ، اور اگر کسی کام میں میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور لکھیے ۔

لندن واپس آ کر میں ایک روز برٹش میوزیم میں کام کر رہا تھا کہ ایک مضمون میری نظر سے گزرا جس میں عربی اور فارسی کے حروف کو رومن رسم‌الخط میں منتقل

کرنے کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا تھا ۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ پیرس کی ببلیوتک ناسیونال میں ایک کتاب میں میں نے Transliteration کے اصول کچھ مختلف صورت میں دیکھے تھے ۔ میں نے برٹش میوزیم کے ایک عہدیدار کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ؛ کہنے لگے صاحب ! اس معاملے میں مستشرقین میں اختلاف چلا آتا ہے ۔ فرانسیسی ، جرمن ، ہسپانوی ، انگریز مستشرقین عربی اور فارسی زبان کے حروف کی نقل لفظ (Transliteration) کے لیے کسی ایک اصول پر متفق نہیں ہیں ۔ یہی صورت حال عبرانی زبان کے حروف کے بارے میں بھی ہے ۔ اور چینی زبان کے حروف کی Transliteration کے اصول گزشتہ پچاس سال میں چار مرتبہ بدل چکے ہیں ۔ میں نے کہا کہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ اختلافات نہ رہیں ۔ بے چارہ دل جلا معلوم ہوتا تھا ، کہنے لگا : ”ضرور کوشش کیجیے اور اس میں ناکامی کے بعد اگر خودکشی کا ارادہ کریں تو مجھے مطلع فرمائیے گا ؛ میں بھی آپ کا ساتھ دوں گا ۔“

میں نے انڈیا آفس لائبریری میں دیکھا کہ وہاں بھی نقل لفظ کے اصول دوسری جگہ سے مختلف تھے۔ میں نے ان اختلافات پر رائے دینے کے بارے میں پروفیسر آربری کو لکھا ۔ آربری صاحب نے مجھے جواب میں لکھا کہ یہ اختلاف

بدقسمتی سے پرانا ہے ۔ لیکن اب انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تالیف کے سلسلے میں اس مسئلے پر کافی حد تک اتفاق ہو گیا ہے ۔ میں لندن یونیورسٹی کے پروفیسر برنارڈ لوئی سے دریافت کروں ۔ پروفیسر برنارڈ لوئی ان دنوں امریکہ میں تھے، ان کے دفتر سے میں نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں Transliteration کے بارے میں معلومات حاصل کیں ۔ بہرحال اب تک مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے پیش نظر عربی ، فارسی (اور اردو) حروف کی Transliteration میں جو اختلافات ہیں اس کے چند نمونے ذیل میں پیش کرتا ہوں ۔

عربی فارسی حروف	رومن حروف			
حوالہ جات -->	الف	ب	ج	د
چ	ch	<u>ch</u>	c	Č
خ	<u>kh</u>	<u>Kh</u>	ḥ	<u>Kh</u>
ش	sh	sh	c/ṣ	<u>Sh</u>
غ	<u>gh</u>	ġ	ġ	<u>gh</u>

حوالہ جات :

الف : انگریز مستشرقین عمومی طور پر

ب : انڈیا آفس لائبریری

ج : فرانسیسی کتاب مصنفہ

Charles Fossey
"Notices sur les caracteres etrangers anciens et Modernes" Paris, 1948.

(یہ کتاب مستشرقین کی اکیسویں سالگرہ کے موقع پر شائع کی گئی تھی) ۔

د : انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرانسیسی اور انگریز مستشرقین میں اس مسئلے پر خاصا اختلاف ہے ۔ ممکن ہے جرمن اور ہسپانوی مستشرقین کے ہاں بھی یہی کیفیت ہو لیکن چوں کہ میں جرمن اور ہسپانوی زبانیں نہیں جانتا اس لیے اس بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا ۔

میں نے مذکورہ بالا مثالیں اس لیے دی ہیں کہ اگر مشرقی زبانوں کے اداروں میں باہمی روابط قائم کیے جائیں اور معلومات کے تبادلے کا کام زیادہ منظم طور پر ہو تو غالباً اس قسم کے اختلافات کم ہو جائیں گے ۔

افرو ایشیائی سیمینار

ادب ، فن اور ثقافت کے مسائل پر تبادلۂ خیالات

افریقہ اور ایشیا کے بیشتر ملکوں کے دانشوروں ، ادیبوں ، شاعروں اور فن کاروں کا سیمینار لاہور میں ۱۰ فروری ۱۹٦۵ع کو منعقد ہوا اور ۱۴ فروری ۱۹٦۵ع تک جاری رہا ۔ اس کا افتتاح صدر ایوب نے کیا ۔ افتتاح کے وقت افریقی ایشیائی ممالک کے مندوبین اور دیگر معززین کے علاوہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران بھی بہ حیثیت مہمان خصوصی موجود تھے ۔ اس سیمینار کی مختلف کمیٹیوں کی کارگزاری ، قراردادیں اور مندوبین کے مقالوں میں سے بعض کے اقتباسات اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں ۔ توقع ہے کہ تمام مقالے کتابی صورت میں بھی شائع ہوں گے ۔ اس لیے یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ۔ میں بھی اس سیمینار میں کراچی کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے شامل ہوا تھا اور چند تاثرات لے کر واپس آیا ۔

سیمینار کے کھلے اجلاس کے بعد مندوبین چار کمیٹیوں

میں تقسیم ہو گئے تھے - ہر کمیٹی نے ثقافت کے ایک مخصوص پہلو کا تفصیل سے جائزہ لیا - میں اس کمیٹی کا رکن تھا جس میں لسانیات کے مسائل پر مقالے پڑھے گئے اور تبادلۂ خیالات ہوا - اس کمیٹی کے علاوہ ایک کمیٹی افریشیائی ممالک میں فن کاروں اور دانش وروں کے مسائل سے متعلق تھی اور ایک کمیٹی کا تعلق افریشیائی ملکوں کے باہمی ثقافتی روابط کے تاریخی پس منظر سے تھا - ان کمیٹیوں کی کارگزاری ان کی رپورٹوں اور مندوبین سے گفتگو کے بعد میرے علم میں آئی -

دانش ور کی تعریف :

سیمینار کی پہلی کمیٹی کا موضوع "افریقی ایشیائی ملکوں میں فن کاروں کا کردار" تھا - اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے شروع میں دانشور کی تعریف کسی قدر تفصیل سے کی ہے - تصورات کی قطعی تعریف اکثر اوقات ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوتی ہے ، لیکن یہ تعریف اس قدر وضاحت سے کی گئی ہے کہ 'دانش ور' کے تصور کے بیشتر مضمرات ذہن میں آ جاتے ہیں - انگریزی متن کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"اس کمیٹی کی رائے میں دانش ور اور تخلیقی فن کار وہ ہے جسے اپنے گرد و پیش کی حقیقت

کا احساس ہو ۔ یہ حقیقت ماضی اور حال کے تجربات کا نچوڑ ہے ۔ دانشور وہ ہے جس نے نہ صرف اپنی مخصوص جماعت سے رشتہ قائم کیا ہو بلکہ وہ عام انسانیت سے بھی رشتے میں منسلک ہو ۔ اس کا (حقیقی دانشور کا) سماجی انصاف کے اصولوں سے گہرا تعلق ہو اور وہ ان کی حفاظت کا پابند ہو ، چاہے اس فرض کی ادائیگی میں اسے ہر قسم کی قربانیاں ہی کیوں نہ دینی پڑیں ۔ جہالت اور دیگر بیرونی مضر اثرات کو ختم کر دینا جس کے فرائض میں داخل ہو ؛ جو آزادی پر ایمان رکھتا ہو اور اسے حاصل کرنے میں جدوجہد کرتا ہو ، چاہے آزادی سے محروم کرنے کی کوشش کہیں بھی اور کسی شکل میں بھی کی جا رہی ہو ؛ جو انسان کی عظمت اور ناقابل تردید انسانی حقوق یعنی آزادی ، حریت اور مساوات کا علم بردار ہو ، وہ دنیا کو امپیریلزم اور نوآبادیت کی لعنتوں سے پاک کرنے کا حامی ہو ۔ جو آزادی کی جنگوں کی تائید کرتا ہو ، چاہے یہ جنگیں دنیا کے کسی حصے میں بھی لڑی جا رہی ہوں ؛ جو خود

علم سے بہرہ مند ہو اور علم کو اُن تک
پہنچاتا ہو جو اس سے محروم ہیں ؟ جو اپنی
قوم کا ضمیر ہو اور اُن قوموں کا ضمیر بھی
جو اس کے ملک میں نہیں بستیں ؟ جو ایمان
رکھتا ہو کہ آزادی کے بغیر امن ممکن نہیں ؛
جو ہر ملک میں آزادی ، امن اور مساوات
اور انصاف کے لیے اس لیے جدوجہد کرتا ہو کہ
اس کا دائرۂ عمل سرحدوں کے ذریعے محدود
نہیں کیا جا سکتا ، چاہے وہ سرحدیں علاقائی
ہوں ، نسلی ہوں یا مذہبی ؛ جس کی دیانت
کبھی متزلزل نہ ہوتی ہو ؛ جو بلا خوف آزادی
سے بولتا ہو اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے
کی تعلیم دیتا ہو ۔“

اس بیان پر غالباً تبصرے کی ضرورت نہیں ۔ اس پر غور کرنے اور بار بار غور کرنے کی ضرورت ہے ۔

قومی زبان اور رابطے کی زبان :

سیمینار کی لسانی کمیٹی میں زبان کے مسائل پر مضامین پڑھے گئے اور بحث ہوئی ۔ بعض مندوبین (مثلاً ہندوستان) نے اپنے ملک کے لسانی مسائل پر اظہار خیال کیا اور بعض حضرات نے افریقی ایشیائی ملکوں میں رابطہ قائم کرنے

کے لیے ایک مشترک زبان کے انتخاب کے بارے میں تجاویز پیش کیں ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد دکن) نے اپنے مختصر لیکن بصیرت افروز مضمون میں ہندوستان میں مختلف زبانوں کے چند در چند مسائل کا ذکر کرنے کے بعد تجویز پیش کی کہ دیگر زبانوں کے علاوہ ایک ایسی زبان بھی ہے جو ہندوستان اور پاکستان اور دیگر ایشیائی ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ اس زبان کا نام ڈاکٹر مسعود حسین خان نے 'ہردو' قرار دیا ، یعنی ہندی اردو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا تھا اور جسے دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے ۔

افریقی ایشیائی ممالک میں زبان کے مسئلے پر بحث کے بعد ایک بات صاف طور پر سمجھ لی گئی ؛ ہر ملک کو کم از کم دو زبانوں کی ضرورت ہے ؛ ایک اس کی قومی زبان جو اس ملک کی ثقافت سے پیدا ہوئی ہے اور اُسے ہر قیمت پر باقی رکھنے اور ذریعۂ تعلیم بنانے کی ضرورت ہے ۔ دوسری زبان رابطے کی زبان ہے جس کے ذریعے افریقی ایشیائی ممالک آپس میں اور دنیا کے دیگر ممالک سے رابطہ قائم رکھ سکیں ۔ یہ زبان انگریزی ، عربی ، فرانسیسی ، ہسپانوی یا کوئی اور زبان ہو سکتی ہے ۔ بہر حال ان دونوں زبانوں کو قائم رکھنے میں کوئی تضاد

نہیں ہے ۔

دوسرا نہایت اہم مقالہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی کا تھا جس میں انہوں نے اردو زبان کے ارتقا اور اس کے مختلف مدارج پر نہایت فاضلانہ بحث کی تھی ۔

مشرقی زبانوں کا اثر مغرب پر :

تھائی لینڈ کی مندوب مسز گیسالکٹ نے اپنے مختصر مضمون میں ذکر کیا کہ سترھویں صدی میں جرمنوں نے فارسی شاعری کا ترجمہ کیا ۔ اٹھارھویں صدی میں فرانسیسیوں نے "الف لیلہ" کا ترجمہ کیا ۔ انیسویں صدی میں مشرقی فکر و شعر کا مغرب کے ادب پر گہرا اثر ہوا ، اور فرانس کے وکٹر اوگو نے "بیاض مشرق" (Les Orientales) لکھی ۔ (ان نظموں کا ذکر راقم الحروف اپنے ایک مضمون میں کر چکا ہے) جرمنی میں شوپنہار ہندو اور بدھ فلسفے سے متاثر ہوا ۔ انگلستان میں عمر خیام کی شاعری سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے ۔

کمیٹیوں کی قراردادیں :

سیمینار کی کمیٹیوں نے اپنے مخصوص موضوعات پر تفصیلی بحث کی اور اپنی سفارشات قراردادوں کی صورت میں مندوبین کے اجلاس میں پیش کیں ۔ ان قراردادوں

کو بحث و تمحیص اور بعض ترمیمات کے بعد منظور کر لیا گیا ۔ ان میں نہ صرف دانش‌وروں اور فن‌کاروں کی آزادی اور اتحاد کے مسائل پر زور دیا گیا ہے بلکہ بعض عملی اقدامات کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا ہے ۔ ان اقدامات میں سے ایک اہم فیصلہ یہ ہے کہ افریقی ایشیائی ممالک کے دانش‌وروں اور فن‌کاروں وغیرہ میں رابطہ قائم کرنے کے لیے ایک مستقل دفتر قائم کیا جائے ۔ یہ دفتر افریقی ایشیائی ممالک میں ادب ، فن ، سائنس اور ثقافت کے مسائل کا جائزہ لے گا اور دانش‌وروں اور فن‌کاروں میں اتحاد عمل کے لیے اقدامات کرے گا ۔ اور اس سلسلے میں ان اداروں سے بھی مشورہ اور تعاون حاصل کرے گا جو افریقی ایشیائی ادیبوں اور فن‌کاروں کے مسائل کے سلسلے میں کولمبو ، قاہرہ اور جاکرتہ میں قائم ہو چکے ہیں ۔

زاھد تنگ نظر اور... کافر :

ادبی اور ثقافتی جلسوں اور سیمیناروں کو بعض حلقوں میں ہمیشہ شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بعض اوقات ان کی کارگزاری کو ایسے معنی پہنائے جاتے ہیں جن کا سیمینار کے منتظمین یا مندوبین کے مقاصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ چناں چہ اسی قسم کی باتیں اس سیمینار کے بارے میں بھی سننے میں آئیں ۔ ان باتوں کو سن کر خفا ہونے کی ضرورت نہیں ۔ بعض اوقات

یہ شبہات نیک نیتی پر بھی مبنی ہوتے ہیں ۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو ، انھیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ مثلاً بعض حلقوں میں کہا گیا کہ یہ سیمینار مغربی ملکوں کے خلاف ایک ثقافتی محاذ قائم کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا ، اور دوسری طرف بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سیمینار کا مقصد بائیں بازو کے ملکوں کی مخالفت اور مغربی ممالک اور خصوصاً امریکہ کی تائید کرنا تھا ۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ سیمینار مغربی ملکوں کے خلاف ایک ثقافتی محاذ قائم کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا ۔ اگر مختلف کمیٹیوں کی روئداد کا بغور مطالعہ کیا جائے تو حقائق کا علم ہوجائے گا ۔ یہ فطری امر تھا کہ افریقی ایشیائی ادیبوں کے سیمینار میں امپیریلزم کے خلاف آواز بلند کی جاتی ، لیکن اس سے مغربی ملکوں کے ادیبوں اور دانش وروں کو شکایت نہیں ہونی چاہیے اول تو یہ کہ خود مغربی ممالک کے سیاست دان اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ اب نوآبادیت کا دور ختم ہو چکا ۔ جب نوآبادیت کا دور تھا تو مغربی قوموں نے مشرق میں فتوحات حاصل کیں ، اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ مشرق میں بھی بعض قوموں نے یورپ جا کر ممالک فتح کیے اور سال ہا سال حکومت کی ۔ بہرحال اب جہاں گیری کا وہ دور مغرب اور مشرق دونوں میں ختم ہو چکا ہے ۔

دوسرے یہ کہ اگر امپیریلزم کے رجحانات کسی دوسری شکل میں باقی ہیں تو مشرق اور مغرب کے ادیب ، دانش ور ایک زبان ہوکر اس کی مذمت کرتے ہیں ۔ چناں چہ سیمینار میں کئی مقررین نے فرانس کے دانش ور اور ادیب ژاں پال سارتر کو خراج تحسین پیش کیا جس نے الجیریا کے مسلمانوں کی آزادی کی حمایت میں خود اپنے وطن فرانس کے خلاف جد و جہد میں حصہ لیا ۔ اسی طرح سیمینار میں بعض مندوبین نے مغربی علم و ادب کے مفید پہلوؤں سے استفادہ کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ۔ اور مغرب کی ان زبانوں کو بھی رابطے کی زبان کی حیثیت سے (قومی زبان کی حیثیت سے نہیں) قائم رکھنے کا مشورہ دیا جو اس وقت افریقی ایشیائی ممالک میں رائج ہیں ۔

اسی طرح دوسرا شبہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہے ۔ سیمینار کی کوئی تقریر یا کوئی تجویز یا قرارداد ایسی نہیں جو مشرق کے کسی ملک کے خلاف ہو ، بلکہ بعض جوشیلے مقررین نے امپیریلزم کو اپنے ملک کی تمام تر خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے مغربی ممالک کو کچھ زیادہ ہی برا بھلا کہہ دیا ۔ مندوبین کی تقاریر میں ایک پسندیدہ بات یہ تھی کہ دوسرے ملک کے دانش وروں کی تعریف کرنے میں مندوبین نے سیاسی گروہ بندیوں اور تنازعات کو پیش نظر نہیں رکھا ۔ مثلاً ہندوستان کے وفد

کے مندوب ڈاکٹر ملک راج آنند نے دیگر ممالک کے ساتھ چین کے ادیبوں کی بھی تعریف کی ۔ چین کا نمائندہ باقاعدہ مندوب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ناظر (Observer) کی حیثیت سے سیمینار میں آیا تھا ، تاہم چین کے نمائندے کو سیمینار کے اجلاس میں تقریر کرنے کا موقع دیا گیا ۔ اس کے علاوہ جب لاہور میں سیمینار کے مستقل مرکزی دفتر کے قیام اور آئندہ لائحہ عمل مرتب کرنے کے لیے کمیٹی کا قیام زیر غور تھا تو نیپال کے مندوب نے چین کو اس کمیٹی میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی ۔ لیکن چوں کہ چین کا نمائندہ مندوبین میں شامل نہیں تھا اس لیے اس کمیٹی میں نہیں لیا جا سکا ۔ نیپال کی اس تجویز پر ہندوستان نے کوئی اعتراض نہیں کیا ، بلکہ ہندوستانی وفد کے قائد ڈاکٹر ملک راج آنند نے نیپال کو اس کمیٹی میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی جو منظور کرلی گئی ۔ پاکستان کے مندوبین میں فیض احمد فیض نے اجلاسوں کی کارروائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حسب عادت اختلافی مسائل پر کھل کر اظہار رائے کیا ۔

سچ پوچھیے تو سیمینار کا سب سے زیادہ حوصلہ افزا پہلو یہ تھا کہ دانش وروں اور فن کاروں نے نہ صرف ادب اور فن کو تیسرے درجے کی سیاسی مصلحتوں سے آزاد کرنے پر زور دیا تھا ، بلکہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار

کے تحفظ اور تخلیق کی ضرورت و اہمیت پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ۔ افریقی ایشیائی ملکوں کے فن کاروں کی جد و جہد کچھ عرصہ پہلے بیرونی طاقتوں کے خلاف تھی ، اب اپنے ملک سے افلاس اور جہالت کو دور کرنے کے لیے ہے ۔ فن کار ہمیشہ آزادی کا علم بردار رہا ہے ۔ اس نے ظلم کی ہمیشہ مخالفت کی ہے اور کرتا رہے گا ، چاہے وہ کسی شکل میں بھی ہو ۔

انسانی تمدن کی تاریخ افریقی ایشیائی سرزمین سے شروع ہوئی تھی جہاں آج سے پانچ ہزار سال قبل نیل ، میسوپوٹیمیا اور سندھ کے علاقوں میں تہذیب نے جنم لیا تھا ۔ ان دونوں براعظموں نے دنیا کو علم اور تمدن کی شمع سے فروزاں کیا ۔ چند صدیوں سے یہ شعلہ کچھ ماند سا پڑ گیا تھا ، لیکن اب ابھرتی ہوئی قوموں کے دانش ور پھر بیدار ہوئے ہیں ۔ یہ شعلہ پھر بھڑکے گا اور اس کی روشنی پھر پھیلے گی ۔ کیوں کہ سنا یہی ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے ۔

سیمینار بہ حیثیت مجموعی کامیاب رہا ۔ سیمینار کے منتظمین میں سے اکثر افراد بہ قول ڈاکٹر مسعود حسین خاں "پیشہ ورانِ اردو" قسم کے دانش ور نہیں تھے ، بلکہ انتظامیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ذہن و مزاج کے اعتبار سے واقعی دانش ور تھے ۔ انھوں نے مختلف ممالک کے مختلف الخیال

دانش وروں اور فن کاروں کو ایک مقام پر جمع کیا اور ایک نئی تحریک کی ابتدا کی ۔ اس سیمینار کے روحِ رواں جواں سال تجمل حسین تھے جنھوں نے سیمینار کی نشستوں میں ادیب، سیاست دان ، مقرر ، منتظم ، ڈپلومیٹ ، غرض کہ کئی قسم کی بوقلموں شخصیت کا مظاہرہ کیا اور انھیں ہر منتظم اور مندوب کا تعاون حاصل رہا ۔ اس کے باوجود اگر بعض حلقوں اور افراد کو سیمینار سے شکایت ہو تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں ۔ ایسے بڑے بڑے اجتماعات کے بارے میں جن میں کچھ کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں ہمیشہ کوئی نہ کوئی بات ضرور کہی جاتی ہے جسے سن لینا چاہیے ۔

اہم بات یہ ہے کہ اس سیمینار سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوا اور بہت کچھ حاصل ہونا باقی ہے ۔ جام ابھی لب ریز نہیں ہوا ، نصف خالی ہے ۔ اس پر افسوس کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس پر خوش ہوا جائے کہ نصف جام تو بھرا ہوا ہے ۔

یورپ میں غالب کا مطالعہ

اردو زبان کی تعلیم یورپ کی کئی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔ جن مستشرقین کو اردو اور برصغیر پاک و ہند کے فارسی ادب سے دل‌چسپی رہی ہے، انھوں نے غالب کا مطالعہ کیا ہے۔ ادھر آٹھ دس سال سے اقبال اور غالب کے مطالعے میں یورپ میں خاص دل‌چسپی لی جا رہی ہے۔ غالب کے کلام کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ نظم و نثر کے تراجم یورپی زبانوں میں کیے جا رہے ہیں۔ غالب کے فکر و اسلوب پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ یہ سب ہو رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو ان یونیورسٹیوں کے کام میں دل‌چسپی لے اور مستشرقین کو ان کے کام میں مدد دے۔ میں نے اردو نامہ کراچی کے ذریعے ایک مرتبہ درخواست کی تھی کہ جن اداروں میں اردو کی تعلیم ہوتی ہے ان سے باقاعدہ رابطہ قائم کیا جائے، اس کام میں خاطر خواہ دل چسپی نہیں لی گئی۔ اب میں نے خود ہی اپنی بساط کے مطابق اس کام کی ابتدا کی ہے۔

یورپ کے ممالک میں غالب کے مطالعے کی کیفیت مختصراً حسب ذیل ہے :

انگلستان :

حال ہی میں مسٹر رالف رسل ریڈر شعبۂ اردو لندن یونیورسٹی نے غالب پر کام کیا ہے۔ انھوں نے Penguin Companion of Oriental Literature کے لیے اردو ادب پر پانچ مضامین لکھے ہیں جن میں ایک مضمون غالب پر ہے۔ اس کے علاوہ رسل صاحب نے ڈاکٹر خورشیدالاسلام کے ساتھ مل کر غالب کی نثر، نظم اور خطوط کے تراجم کیے ہیں جو یونیسکو کے توسط سے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔

فرانس :

"تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی" کی جلد اول میں گارسیں دتاسی نے غالب کا بیان سات صفحات میں لکھا ہے۔ ابتدا میں غالب کی زندگی کے مختصر حالات کے تحت دتاسی نے لکھا ہے کہ غالب آگرے میں ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ لیکن زیادہ عرصے دلی میں رہے۔ ۱۸۶۳ء میں ان کے کلام کا انتخاب "دیوان[1] میر نوشہ" کے

---

(۱) معلوم ہوتا ہے اس جگہ گارسیں دتاسی سے سہو ہوا ہے۔
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

عنوان سے شائع ہوا ۔ اس کتاب میں ۱۷۹۰ اشعار ہیں ۔ (گارسیں دتاسی نے اس اطلاع کے لیے "اخبارعالم" میرٹھ کے شمارہ ۲۵ جولائی ، ۱۸۶۷ع کا حوالہ دیا ہے) اس کے بعد ۱۸۶۴ع میں ''دیوان غالب" کے نام سے پٹنہ سے شائع ہوا ۔ اس میں ۱۰۴ صفحات ہیں اور ہر صفحے میں ۲۱ سطریں ہیں ۔ ۱۸۶۳ع میں ایک اور مجموعۂ کلام کان پور سے بھی شائع ہوا جو ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔

غالب کا فارسی کلام ۱۸۴۷ع میں منشی نورالدین کے زیر اہتمام شائع ہوا ۔ ان کی کلیات مطبع 'نول کشور' لکھنو سے بھی شائع ہوئی ۔ لسانیات اور تنقید کے موضوع پر غالب کی تصنیف ''قاطع برہان" ۱۸۶۱ع میں شائع ہوئی ۔ غالب نے ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ع) میں وفات پائی ۔

گارسیں دتاسی نے غالب کی وفات پر تین تاریخوں کا حوالہ دیا ہے ۔ پہلی تاریخ غالب کے پوتے مرزا خداداد بیگ شوق نے کہی جو "اودھ اخبار" کے ۲۳ ۔ فروری ۱۸۶۹ع کے شمارے میں شائع ہوئی ۔ دوسری "سرکاری اخبار" لاہور کے ۱۰ مارچ ، ۱۸۶۹ع کے شمارے میں شائع ہوئی ۔

(گزشتہ صفحے کا باقی حاشیہ)

'دیوان میر نوشہ' کے عنوان سے غالب کا کوئی دیوان شائع نہیں ہوا ۔ خیال یہی ہے کہ اس نے 'میرزا نوشہ' کو غلطی سے 'میر نوشہ' لکھ دیا ہے ۔

یہ تاریخ دلی کالج کے پروفیسر وزیر سنگھ نے کہی تھی۔ تیسری غالب کے شاگرد مرزا اوصاف علی نے کہی جو "اودھ اخبار" مورخہ ۴ مئی میں شائع ہوئی۔ "اودھ اخبار" کی ۱۶ مارچ، ۱۸۶۹ع کی اشاعت میں غالب پر ایک مضمون کے بعد (جس کا ذکر آگے آئے گا) ایک تاریخ مرزا قربان علی بیگ کی شائع ہوئی جو انیس اشعار پر مشتمل ہے۔

گارسیں دتاسی نے دو مضامین کا حوالہ دیا ہے جو غالب کی وفات پر "اودھ اخبار" میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین ۱۶ مارچ اور ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ع کے شماروں میں شائع ہوئے۔ گارسیں دتاسی نے دونوں مضامین کا مکمل ترجمہ فرانسیسی میں کیا ہے۔ یہاں ان ترجموں کی تلخیص پیش کی جاتی ہے:

"اودھ اخبار" کے مورخہ ۱۶ مارچ، ۱۸۶۹ع کے پرچے میں جو مضمون چھپا ہے اس میں سب سے پہلے غالب کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اور ان کے خاندانی حالات کا ذکر کرتے ہوئے غالب کی ایک فارسی کی تحریر کی تلخیص پیش کی گئی ہے جس میں غالب نے کہا ہے کہ وہ افراسیاب شاہ ترکستان کی نسل سے ہیں۔ اس کے بعد غالب کی زندگی کے مختصر حالات لکھے

ہیں اور حسب ذیل تصانیف کا ذکر ہے ۔ دس ہزار اشعار کا ایک فارسی دیوان "مہر نیم روز" "دست و بو"[۱] لکھے ہیں ۔ (اس ساری کتاب میں ایک عربی لفظ استعمال نہیں کیا) ۔ "پنج آہنگ" "قاطع برہان" ؛ ایک دیوان ریختہ اور "اردوے معلیٰ"۔

"اودھ اخبار" کے شمارہ ۲۳ مارچ ، ۱۸۶۹ع میں جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا عنوان "غالب کی یادگار قائم کرنے کی تجویز" ہے ۔ اس مضمون میں غالب کے ایک شاگرد محمد مردان علی خاں نے لکھا ہے کہ غالب کی ایک ایسی یادگار قائم کرنا ضروری ہے جو ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے ۔ یادگار قائم کرنے میں ان کے شاگردوں کو خاص طور پر حصہ لینا چاہیے ۔ مردان خاں صاحب نے تجویز کیا ہے کہ اہل دہلی کی ایک خصوصی کمیٹی ایک جلسے میں غالب کی یادگار قائم کرنے کی قرارداد منظور کرے ۔ اس کے بعد اس یادگار کے اخراجات کے لیے رقم جمع کرنے کے لیے ایک فنڈ کھولا جائے ۔ مردان علی خاں صاحب نے ذاتی طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ غالب کی بہترین

---

(۱) یہاں بھی دتاسی سے سہو ہوا ہے ۔ یہ کتاب در اصل 'دستنبو' ہے ۔ اس کتاب میں صرف ایک سال یعنی ۵۸ - ۱۸۵۷ع کے حالات درج ہیں ۔

یادگار ایک خالص ادبی تخلیق ہی ہو سکتی ہے ۔ چناں چہ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک کتاب مرتب کی جائے جس میں غالب کی زندگی کے بارے میں تمام تاریخی معلومات فراہم کرکے شامل کی جائیں ۔ اس کتاب میں غالب کے شاگردوں کی وہ تمام تحریریں شائع کی جائیں جو انھوں نے غالب کی وفات پر لکھیں ۔ مثلاً تاریخ ہائے وفات ، مرثیے وغیرہ ۔ غالب کے شاگردوں کی ایک مکمل فہرست ... ان کے حالات زندگی کے بارے میں مختصر نوٹ بھی ... کیے جائیں ۔ اس کتاب کے دو حصے ہوں ۔ ایک اردو میں ، دوسرا فارسی میں ۔ اس کتاب میں صرف غالب کے شاگردوں کی تحریریں شامل کی جائیں ۔ اگر غالب کے شاگردوں کے علاوہ دوسرے اہل قلم کی تحریریں غالب کی وفات کے سلسلے میں موصول ہوں تو انھیں کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل کر دیا جائے ۔ تجویز ... محرک نے آخر میں لکھا ہے کہ "اگر کسی دوسری ... کو میری تجویز سے بہتر خیال کیا جائے تو بلا تامل اس ... عمل کیا جانا چاہیے ۔"

اٹلی :

مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر باؤسانی ... "اردو اور ہندو فارسی شاعری کی تاریخ میں غالب ..."

کے عنوان سے مغربی جرمنی کے رسالے 'Der Islam' کے
ستمبر ۱۹۵۹ع کے شمارے میں شائع ہوا ہے ۔ اٹھائیس
صفحات پر مشتمل یہ مقالہ دو وجوہ سے نہایت اہم ہے ؛
ایک تو یہ کہ غالب کی شاعری پر کسی یورپین مستشرق کا
... یہ پہلا مقالہ ہے[1] ۔ دوسرے یہ کہ اس مقالے میں
... صاحب نے نہ صرف غالب کی چند غزلیات اور
اشعار کا ترجمہ اور تشریح کی ہے بلکہ اردو فارسی شاعری
کی بہت سی تلمیحات اور تصورات کی مغربی نقطۂ نظر سے
تفسیر اور وضاحت بھی کی ہے تاکہ مغربی اہل ادب کو
مشرقی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملے ۔ ان خصوصیات
... پر یہ مقالہ مغرب میں مشرقی ادب کے تعارف اور
... کے لیے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے ۔

مقالے میں پروفیسر باؤسانی نے غالب پر بیدل کے
اثرات پر بحث کرتے ہوئے پہلے غالب کے ان اشعار کا
حوالہ دیا ہے جنھیں غالب نے اپنے منتخب کلام میں
اس لیے خارج کر دیا کہ ان میں بیدل کا اثر بہت زیادہ
... ۔ مثلاً غالب نے اپنے مطبوعہ دیوان میں ایک
... صرف حسب ذیل اشعار شامل کیے ہیں :

---

[1] ... باؤسانی نے میرے نام ایک حالیہ خط میں اس
... کی ہے ۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا
بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ انداز بہ خوں غلطیدن بسمل پسند آیا

لیکن حسب ذیل چار اشعار منتخب دیوان میں شامل نہیں کیے :

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوق عیش بےپروا
فراغت گاہ آغوش وداع دل پسند آیا
ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی
بہ رنگ لالہ جام بادہ بر محمل پسند آیا
سواد چشم بسمل انتخاب نقطہ آرائی
خرام ناز بے پروائی قاتل پسند آیا
اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار جادۂ بیدل پسند آیا[1]

فاضل مقالہ نگار نے دوسری مثال غالب کی مشہور غزل کی دی ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

---

(۱) یہ مصرع بعض نسخوں میں اس طرح درج ہے :
مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

اس غزل کے ہر شعر کی مفصل شرح کی گئی ہے اور سات ایسے اشعار نقل کیے گئے ہیں جو غالب کے "انتخاب" ۱۸۶۶ع میں موجود نہیں ہیں ۔

غالب کی دیگر غزلیات میں سے چیدہ چیدہ اشعار کا ترجمہ اور شرح پیش کی گئی ہے اور پروفیسر باؤسانی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غالب کو ایک نئے اسلوب کا موجد قرار دینے کے مقابلے میں یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ غالب نے ہندوستانی اسلوب اور بیدل کے اسلوب کو درجۂ کمال تک پہنچایا ۔ اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے جدید اردو شعرا پر غالب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مغربی اسلوب بیان کو خوب صورتی کے ساتھ اردو شاعری میں سمونے کے لیے غالب کا اسلوب ہی بہترین وسیلہ بن سکتا ہے ۔ فاضل مقالہ نگار کی رائے میں فیض نے اس سلسلے میں غالب سے فیضان حاصل کیا ہے اور اس ضمن میں فیض کے کلام سے گیارہ مثالیں پیش کی گئی ہیں ۔ آخر میں پروفیسر باؤسانی لکھتے ہیں : "فیض انگریزی ادب سے خوب واقف ہیں اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے لیکن انھوں نے یہ اثر اس طرح قبول نہیں کیا کہ اچانک تمام مشرقی اثرات سے اپنا رشتہ توڑ دیں اور انگریزی ادب کے زیر اثر آجائیں ۔ اس کے بجائے فیض نے مغربی اثر قبول کرنے کے لیے اسلوب کا وہ راستہ اختیار کیا

جس کی رہنمائی غالب نے کی تھی۔"

ڈاکٹر سولیرنو جو کراچی میں اطالوی کلچرل سنٹر کے ناظم تھے، اردو زبان کے بڑے رسیا تھے۔ انھوں نے پاکستان میں رہ کر اردو سیکھی اور یہیں شادی کی۔ ۱۹۶۴ع میں وہ اٹلی واپس چلے گئے۔ دیگر تصانیف کے علاوہ انھوں نے اردو شاعری کی مختصر بیاض شائع کی جس میں مشہور اردو شعرا کے کلام کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب کا نام "Antologia della Poesia Urdu" ہے اور یہ اٹلی کے شہر میلان سے ۱۹۶۳ع میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر سولیرنو نے اردو شاعری کی مختصر تاریخ اور اس کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ بعض تلمیحات اور تشبیہات کے معانی کی وضاحت اور اردو ادب کی روایات پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سولیرنو لکھتے ہیں کہ "وہ خود اعلیٰ خاندان سے تھے اور انھوں نے اپنی خاندانی نجابت کی روایات سے اپنی شاعری کو متاثر کیا۔ انھوں نے خاندان مغلیہ کا زوال اور حکومت برطانیہ کا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اس المیے سے متاثر ہوئے لیکن انھوں نے محض اس کی نوحہ خوانی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شاعری کے لیے ایک نئی فضا تخلیق کی جس میں شاعر نئے دور کے تقاضوں اور تجربات کی عکاسی کر سکے۔ غالب کے ساتھ اردو شاعری کا کلاسیکی دور ختم ہو گیا۔"

چیکوسلوواکیہ :

چیکوسلوواکیہ میں ۱۹۲۳ء سے اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے اور گزشتہ سات آٹھ سال میں اردو ادب میں ترجمے اور تحقیق کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہوا ہے۔ چیکوسلوواکیہ کے شہر پراگ کے مشرقی ادارے Akademic Orientalni Ustav میں پروفیسر یان مارک (Jan Marek) نے اردو میں گراں قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کے تحقیقی مطالعوں میں میرامّن کا قصہ "چہار درویش" اور اقبال کی "ضرب کلیم" خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے پروفیسر یان مارک کو خط لکھا تھا جس میں ان سے دریافت کیا تھا کہ انھوں نے غالب کا مطالعہ کب اور کیسے شروع کیا اور غالب کی نثر اور شاعری کے بارے میں ان کے کیا تاثرات ہیں؟ پروفیسر یان مارک نے مجھے جواب میں جو خط لکھا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

"میں نے غالب کے کلام کا مطالعہ اس وقت شروع کیا جب میں کارولین یونیورسٹی پراگ میں اردو کورس کا طالب علم تھا۔ غالب کا مطالعہ ہمارے کورس میں لازمی نہیں تھا لیکن میں اور مسز ہبش منووا، (Hubschmannova) ہم دونوں طالب علم غالب کے مطالعے میں شرکت کرتے تھے کیوں کہ ہمیں اردو کی

کلاسیکی شاعری سے خاص دل چسپی تھی ۔
ہمارے استاد ایک ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر
مسعود علی خاں تھے جو بھوپال کے رہنے والے
تھے ۔ وہ آج کل ماسکو میں ایک اخبار کے
نامہ نگار ہیں ۔ ڈاکٹر مسعود علی صاحب اردو
کلاسیکی شاعری پر پورا عبور رکھتے تھے ۔
انھیں بہت سی غزلیات زبانی یاد تھیں اور وہ اشعار
کے معانی سے خوب واقفیت رکھتے تھے ۔ میں
اس کا اعتراف کروں گا کہ پہلے پہلے میں غالب
کے اشعار کو بالکل نہ سمجھ سکا ۔ غالب کی
زبان تو کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی ، انفرادی
طور پر میں ہر لفظ کے معنی اچھی طرح سمجھ
لیتا تھا لیکن پورے جملے یا بیت کا اصل
مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ یہ واقعہ ہے کہ
یہ محرومی زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہی ۔
دو تین ہفتوں میں ہم غالب کی غیر مانوس
تشبیہات اور رموز سے واقف ہو گئے ۔

غالب ہندوستان اور پاکستان کے اہل علم اور
اوسط درجے کے شہریوں میں کافی مقبول ہیں ۔
لیکن میں نے کسی عام آدمی کو غالب کے
اشعار پڑھتے نہیں سنا حالانکہ میں کئی بار

ہندوستان اور پاکستان جا چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں ایسا ہونا ایک فطری امر ہے ۔ غالب کی شاعری کو اچھی طرح سمجھنا عام آدمی کے لیے مشکل ہے ۔ غالب کو عجیب اور غیر معمولی الفاظ کا استعمال پسند تھا ۔ جب میں نے بعد میں فارسی شاعری کا مطالعہ کیا تو میرے اس خیال کی تائید ہوئی ۔ اس لیے ایک لحاظ سے غالب کی فارسی شاعری کو اردو شاعری پر فوقیت حاصل ہے ۔ خالص ادبی نقطۂ نظر سے اردو شاعری کے مقابلے میں اُن کی فارسی شاعری کا پلہ بھاری ہے ۔ ان کی مشکل زبان اور غیر مانوس تشبیہوں کی وجہ سے ان کی شاعری کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے میں شدید مشکلات حائل تھیں ۔ غالب کو انیسویں صدی کے پہلے نصف کا بہترین اور اہم شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن ان کے کلام کے یورپی زبانوں میں بہت کم تراجم ہوئے ہیں اور جو ترجمے کیے بھی گئے ہیں، وہ زیادہ‌تر یا تو محض خیال آرائیوں پر مبنی ہیں یا غزل کے قافیے اور ردیف کے ظاہری حسن و خوبی پر طویل اور اکتا دینے والی بحثیں

ہیں ۔ غالب کی شاعری کا ایک اچھا جائزہ
ایک کتاب میں ملتا ہے جو حال ہی میں
تاجکستان سے شائع ہوئی ہے ۔ اس کتاب کا نام
Hayatva Godiyat-e-Mirzo Asadullo Golib
(حیات و ایجادیات مرزا غالب) ہے اور اس کے
مصنف عبداللہ جان Abdullajan Galforov
غفوروف ہیں ۔ ۱۵۲ صفحات کی یہ کتاب
۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی ۔ آج کل ہم اپنے طالب
علموں کے لیے یہی کتاب تجویز کرتے ہیں ۔"

غالب پر پروفیسر یان مارک کا ایک مضمون "اردوئے معلیٰ" دہلی کے غالب نمبر فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون سے ایک مختصر اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :

"یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب سے
ہمیں اس قدر شدید محبت کیوں ہوگئی ؟ اس کا
واحد جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ غالب کی
عظیم شخصیت اور اس کے وجد آفریں اشعار نے
ہمارے دل و دماغ پر جادو سا کر دیا ۔
غالب زندگی کے حقائق سے آنکھیں چار کرنے
کا حوصلہ رکھتے ہیں ۔ اُن کے کلام میں
نشاط اور الم کی سچی تصویریں ملتی ہیں ..."

چیکوسلوواکیہ کے مشرق ادارے کی ایک اور گریجویٹ مسز ہبش منووا[1] Hubschmannova ہیں - یہ خاتون آج کل ریڈیو سے متعلق ہیں - انھوں نے نظیر اکبرآبادی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کی نظموں کے چیک زبان میں ترجمے کیے ہیں - انھوں نے علی سردار جعفری کی نظم "ایشیا جاگ اٹھا" پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے - ان کا سب سے اہم کام غالب کے کلام کا چیک زبان میں ترجمہ ہے - پروفیسر یان مارک نے مجھے مطلع کیا ہے کہ یہ ترجمہ عنقریب پراگ سے شائع ہوگا -

---

(۱) اس سلسلے میں میں نے مادام ہبش منووا سے بھی معلومات فراہم کیں ؛ ۱۱ فروری ۱۹۶۶ع کے ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے غالب کی چالیس پینتالیس غزلوں کا ترجمہ تقریباً دس سال پہلے کیا تھا اور مسودہ ایک ناشر کے حوالے کر دیا تھا - ناشر نے مجھے بتایا تھا کہ مسودہ اشاعت کے لیے منظور کر لیا گیا ہے لیکن آج تک اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی - لیکن پروفیسر یان مارک کی تحریر کے مطابق یہ ترجمہ پراگ سے شائع ہو رہا ہے -

جنگ اور ادب[1]

انسان فطرتاً جنگ پسند ہے ؟

یہ ایک گہرا نفسیاتی مسئلہ ہے ۔ ماہرین نفسیات نے ظلم (Sadism) اور جارحیت (Aggression) کے بیان میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ جذبے کسی نہ کسی شکل میں انسان میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں ۔ یہاں مفصل

(۱) ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے موقع پر ماہنامہ "افکار" کراچی کا ایک خاص نمبر شائع ہوا تھا ۔ اس نمبر میں "جنگ اور ادب" کے عنوان سے ایک مذاکرہ بھی شامل تھا جس میں راقم الحروف کے علاوہ جناب الطاف گوہر، سید الطاف بریلوی، جناب مجتبیٰ حسین، سید محمد تقی، جناب فدوس صہبائی، بریگیڈیر گلزار احمد، جناب احسن علی خاں، جناب سحر انصاری اور ڈاکٹر حسن منظر نے حصہ لیا تھا مذاکرے میں حسب ذیل سوالات کیے گئے تھے :

(۱) کیا انسان فطرتاً جنگ پسند ہے؟

(۲) دنیا کی جنگوں نے ادب پر کیا اثرات ڈالے ہیں ؟

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

فنی بحث کا موقع نہیں ۔ یوں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مقابلہ (Conflict) زندگی کے ازلی اور ابدی قانون سے ہے ۔ تمام جان‌دار اشیا زندہ رہنے کے لیے بنیادی طور پر دو قسم کے محاذوں پر جنگ کرتی ہیں ۔ ایک آن زہریلے جراثیموں سے جو ان کے جسم میں موجود ہوتے ہیں اور انھیں ہلاک کرنے کے لیے ہمیشہ نبرد آزما رہتے ہیں ۔ دوسرا محاذ وہ جانور ہیں جو انھیں کھا جانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں ، اس لیے اگر ان جان داروں (جانوروں اور انسانوں) میں دفاع اورجارحیت کا جذبہ موجود نہ ہو تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے ۔ چناں‌چہ قدرت نے ہر جان‌دار شے میں زندہ رہنےکے لیےجارحیت کا بنیادی رجحان پیدا کیاہے ۔

انسانوں میں یہی رجحان ، یہی جبلت ، یہی جذبہ ، افراد سے بڑھ کر خاندانوں ، جماعتوں ، قبیلوں اور قوموں میں کارفرما ہوتا ہے ۔ وہاں بھی جنگ کے یہی دو محاذ

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

(۳) جنگ کے دوران تخلیق‌کردہ ادب کی دوامی حیثیت ممکن ہے ؟

(۴) جنگ اور امن کے زمانے میں ادیب کی کیا ذمہ‌داریاں ہیں ؟

(۵) ہند و پاک کی حالیہ جنگ کے بارے میں ادیب کی حیثیت سے آپ کے کیا تاثرات ہیں ؟

ہوتے ہیں ۔ خاندان اور جماعتیں اپنی فلاح اور سالمیت کو قائم رکھنے کے لیے اُن عناصر کو دباتی ہیں جو خاندان یا جماعت کے لیے خطرناک ہوتے ہیں ۔ اسی کے ساتھ ساتھ جب خاندانوں یا جماعتوں کو دوسرے خاندانوں یا جماعتوں سے خطرہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی بقا کے لیے ان سے نبرد آزما ہوجاتی ہیں ۔ یہی صورت قومیں بھی اختیار کرتی ہیں ۔ ایک زندہ قوم اُن عناصر کو پنپنے نہیں دیتی جو زہریلے جراثیم کی طرح اس کی فلاح و بقا کے لیے خطرہ ہوتے ہیں ، اور اس کے ساتھ دوسرے محاذ پر وہ ان قوموں سے برسر پیکار ہوتی ہے (یا اس کی تیاری کرتی ہے) جو اس کی بقا اور سالمیت کے لیے خطرہ ہیں یا خطرہ بن سکتے ہیں۔

اور اس طرح ہر قوم میں ہمیشہ جنگ کا عمل جاری رہتا ہے ۔ قومیں یا تو جنگ کی تیاریاں کرتی رہتی ہیں یا جنگ کرتی رہتی ہیں یا جنگ کے بعد کے نقصانات کی تلافی میں مصروف رہتی ہیں ۔

فلسفیانہ نقطہ ہائے نظر بھی اس نظریے کی تائید میں ہے ۔ مثلاً ہیگل کا "جدلیاتی عمل" (Dialectic Process) بھی جنگ کی تائید میں ہے ۔ دنیا میں ہر شے کی ایک ضد موجود ہے ۔ اس لیے دنیا کی ہر شے بذات خود ایک ضد ہے ۔ ہر تصور محدود ہے اور اس کی ضد موجود ہے ، جو اس سے متصادم رہتی ہے ۔ خود ہر تصور بھی ایک

حد سے گزر کر خود اپنا "عکس" پیدا کر لیتا ہے۔ دو متضاد تصورات کے تصادم کو ہیگل کی زبان میں دعویٰ۔۔۔رد دعویٰ کا تصادم کہا جاتا ہے۔ اس تصادم سے ایک تیسرا تصور پیدا ہوتا ہے جسے "ترکیب" کہتے ہیں۔ ہیگل کے فلسفے کے مطابق یہ عمل ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ خود نبض کائنات کا زیر و بم تصورات کی اسی ستیزہ‌کاری کا مظہر ہے۔ یہی جدلیاتی عمل قوموں کے عروج و زوال کا آئینہ‌دار ہے۔

جنگ کی ناگزیر ضرورت اور اہمیت پر مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ میکیاولی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حکومتیں دو اہم بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں؛ ایک بنیاد قانون ہے اور دوسری بنیاد اسلحہ[1]۔ جنگ انسانی تہذیب کی تاریخ میں نہایت اہم موضوع رہی ہے۔ چنانچہ ادیبوں نے زندگی کی اس ناخوشگوار حقیقت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ دنیا کی بیشتر قوموں کے ادب میں رزمیہ نظمیں موجود ہیں جن کو کلاسیکی ادب کی حیثیت حاصل ہے۔ ذیل میں صرف چند قوموں کے ادب میں رزمیہ نظموں کا مختصراً تذکرہ پیش کیا جاتا ہے:

---

(۱) ملاحظہ ہو "بادشاہ" - باب دوازدہم -

یونانی ادب :

قدیم یونانی ادب میں بعض نظمیں جنگ کے موضوع پر لکھی گئیں لیکن ان میں سے بیشتر نظموں کے مطبوعہ نسخے یا مسودات اب نہیں ملتے ۔ رزمیہ نظموں میں یونانی ادب کی دو کتابوں نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی :

۱ ۔ ایلیڈ (Iliad) : اس میں ٹرائے کے محاصرے کا ذکر ہے جو یونانیوں نے کیا تھا ۔ اس کتاب کے چوبیس حصے ہیں ۔

۲ ۔ اڈیسی (Odyssey) : اس میں یولیسیس کی سیر و سیاحت اور بہادری کے کارناموں کا ذکر ہے ۔ یہ کتاب بھی چوبیس حصوں پر مشتمل ہے ۔

اس کتاب کے مصنف ہومر کے بارے میں بہت کم معلوم ہو سکا ہے ۔ بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہومر ایک افسانوی کردار ہے جس کے نام سے یہ کتابیں منسوب ہیں ۔ بہرحال خیال کیا جاتا ہے کہ ان کتابوں کا مصنف سنہ ۱۲۰۰ اور سنہ ۸۵۰ قبل مسیح کے درمیان زندہ تھا ۔ ان رزمیہ نظموں نے عالمگیر شہرت حاصل کی اور ان کے تراجم دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں ۔ ان کے علاوہ پینڈار ، انٹی ماکس ، ہانے سیس نے بھی رزمیہ نظمیں لکھی ہیں جو کافی مشہور ہوئیں ۔

لاطینی ادب :

کہا جاتا ہے کہ لاطینی زبان میں سب سے قدیم رزمیہ نظم نبولیس کی Bellum Punicum ہے جس سے ورجل نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس کے بعد تقریباً سنہ ۱۷۲ قبل مسیح میں اینیس (Ennius) نے ایک طویل تاریخی رزمیہ نظم موسومہ Annales لکھی جو اٹھارہ حصوں میں ہے۔ اس میں روم کی تاریخ تفصیل سے بیان کی گئی ہے اور ان جنگوں کا بھی ذکر ہے جن سے روم کے فرماں رواؤں کا تعلق رہا۔ اس کے بعد لاطینی ادب کے شہرۂ آفاق شاعر ورجل کی طویل رزمیہ نظم اینیڈ (Aeneid) ہے جسے ورجل نے سنہ ۳۰ قبل مسیح میں لکھنا شروع کیا اور نو سال تک لکھتا رہا، لیکن تا دم آخر یہ نظم مکمل نہ ہوسکی۔ ورجل نے وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد کتاب کے مسودے کو نذر آتش کردیا جائے، کیوں کہ یہ نامکمل تھا اور ابھی اس کو مکمل کرنے کے لیے تین سال کی مدت اور درکار تھی۔ ورجل کے بعد چند اور رزمیہ نظمیں لوکن اور سٹاٹیس وغیرہ نے لکھیں جن میں Thebaid مشہور ہوئی۔ پہلی صدی عیسوی میں فلیکس نے مشہور رزمیہ نظم Argonautica آٹھ جلدوں میں لکھی، اور اٹالیکس نے Punic War سترہ جلدوں میں لکھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم لاطینی کلاسیکی ادب میں جو

مقام ورجل کی اینیڈ کو حاصل ہوا وہ کسی دوسری رزمیہ نظم کو حاصل نہ ہو سکا۔

اینیڈ کی تصنیف کے لیے ورجل کے سامنے تین اہم مقاصد تھے۔ ورجل چاہتا تھا کہ وہ اپنی کتاب میں نہ صرف عہد عتیق کے جنگی سورماؤں کی شجاعت کے قصوں کی یاد تازہ کرے بلکہ ماضی کے تصورات کو عہد جدید کے رجحانات اور نظریات سے بھی ہم آہنگ کرے، اور مملکت روم اور اس کے فرماں رواؤں کی شان و شوکت اور ملک گیری کی داستانیں بیان کرے۔ چناں چہ اس نے ہومر کی ایلیڈ اور اڈیسی کی داستانوں کے انداز میں اینیس کی سیر و سیاحت اور فتوحات کی داستانوں کو اپنی رزمیہ نظم میں بیان کیا ہے۔ ورجل کی اینیڈ میں آج سے دو ہزار سال قبل کے یورپ کی تاریخ، تمدن اور معاشرت کے بارے میں بیش بہا معلومات کا خزانہ موجود ہے۔

جرمن ادب:

جرمن ادب کے ابتدائی دور میں کئی رزمیہ نظمیں لکھی گئیں لیکن جس نظم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ "بوولف" (Beowulf) ہے۔ یہ رزمیہ نظم ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی۔ اس میں قدیم دیومالاؤں کے انداز میں ایک طویل داستان

بیان کی گئی ہے ۔ بوولف ایک جاں باز پہلوان اور سیاح ہے ۔ وہ ایک معرکے میں گرینڈل نامی ایک دیو کو ہلاک کرتا ہے ۔ پھر اس کا مقابلہ اس دیو کی ماں سے ہوتا ہے جو اپنے بیٹے کی طرح ایک قوی ہیکل دیو صفت عورت ہے ۔ بوولف اس کو بھی قتل کر دیتا ہے ۔ اس کے بعد ایک مہیب اژدہا اس سے نبردآزما ہوتا ہے اور بوولف اسے بھی زیر کر کے ہلاک کر دیتا ہے ۔ نظم کے آخر میں اس کا ہیرو بوولف خود بھی ہلاک ہو جاتا ہے ۔ اس قسم کی قدیم کلاسیکی نظموں کی طرح اس رزمیہ نظم کی اہمیت کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ اس زمانے کی معاشرت اور طرز زندگی پر روشنی ڈالتی ہے ۔ اس نادر کتاب کا مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے ۔

پرتگیزی ادب :

قدیم پرتگیزی ادب میں کئی رزمیہ نظمیں ملتی ہیں لیکن سب سے مشہور رزمیہ نظم پرتگیزی ادب کے مشہور شاعر لوئی واز دا کاموئنز (Luis Vaz de camoens) نے سنہ ۱۵۷۲ع میں لکھی ۔ اس کتاب کا نام Os Lusiados یعنی "لوسی تانیا کے لوگ" ہے ۔ لوسی تانیا قدیم رومن حکومتوں کے دور میں اس علاقے کو کہا جاتا تھا جسے اب پرتگال کہتے ہیں ۔ اس علاقے میں اسپین کا کچھ حصہ

بھی شامل تھا ۔ اس رزمیہ نظم میں پرتگیزوں کی بہادری اور شان و شوکت کی داستانیں بیان کی گئی ہیں ۔

ھسپانوی ادب :

قدیم کلاسیکی ادب کی مشہور ترین رزمیہ نظم سد کامپیادور" (Cid Campeador) ہے ۔ اس نام کا پہلا لفظ عربی یعنی "سید" ہے اور دوسرا لفظ ہسپانوی زبان کا ہے جس کے معنی ہیں فاتح ۔ اس نظم میں ایک بہادر سپاہی کی داستان بیان کی گئی ہے جو اسپین کی تاریخ کے اس دور سے متعلق ہے جب مسیحی اور مسلمان بر سر پیکار تھے ۔ "سید فاتح" کبھی مسیحیوں کی طرف سے لڑا اور کبھی مسلمانوں کی طرف سے اور آخرکار والنسیا فتح کرکے ۱۰۹۹ع تک حکومت کرتا رہا ، یہ رزمیہ نظم ۱۱۳۵ع اور ۱۱۷۵ع کے درمیان لکھی گئی ۔ اس کے بعد کے ہسپانوی ادب میں بھی "سید فاتح" کی مہمات اور فتوحات کے تذکرے ملتے ہیں[1] ۔

---

(۱) اس کتاب میں Cid یعنی "سید" کا کردار اتنا دل چسپ اور خیال آفریں بیان کیا گیا ہے کہ یورپ اور خصوصاً فرانس کے بعض ادیبوں نے بھی اپنے ڈراموں اور کہانیوں کے بعض کرداروں کے نام سید رکھے ۔ چناں چہ سنہ ۱۶۰۰ع

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

عربی ادب :

عربی ادب کے بعض "قصائد" (جو موضوع کے اعتبار سے فارسی اور اردو قصائد سے مختلف ہوتے ہیں) میں رزمیہ شاعری ملتی ہے۔ مثلاً حسب ذیل شعرا نے اپنے قصائد میں رزمیہ موضوع پر لکھا ہے : حارث بن حلزہ زہیر (معلقہ)، عمرو ابن کلثوم نولیہ۔ عباسی دور میں ابو تمام کا نام رزمیہ شاعری کے لیے مشہور تھا۔ ابو تمام نے اناطولیہ کی فتح

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ)

میں فرانسیسی ادیب دو پیریر (Du Perier) نے اپنی ناول
La Hayne et l'Amour d'Arnoul et de Clairemonde
میں سید نام کا ایک کردار پیش کیا۔ پھر ۱۶۱۳ء میں
کاسترو (Castro) نے اپنے ڈرامے Las Mocedades del Cid
(سید کی جوانی) میں مرکزی کردار کا نام سید رکھا۔
اور اس کتاب سے متاثر ہو کر فرانس کے مشہور ڈراما نگار
کارنائی (Corneille) نے ۱۶۳۷ء میں اپنے شہرۂ آفاق
ڈرامے کا نام سید (Cid) رکھا۔ یہ ڈراما کارنائی کی بہترین
تصانیف میں شمار ہوتا ہے۔ سید کا کردار اس قدر مقبول
ہوا کہ فرانسیسی ادب میں "Beau comme le Cid" (اتنا
اچھا جیسے سید) ایک ضرب المثل بن گئی۔
"سید" کی تاریخی حیثیت پر والتیر نے خاصی تفصیل سے
لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو : "Essai sur les moeurs" جلد اول
باب ۴۴۔

عموریہ کے موضوع پر قصیدہ بائیہ لکھا ۔ یہ قصیدہ تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں لکھا گیا ۔ اس کے علاوہ دور اموی میں بھی جریر ، اخطل اور الفرزوق کے کلام میں رزمیہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں[1] ۔

روسی ادب :

روسی ادب کی ابتدا تقریباً گیارھویں صدی سے ہوتی ہے۔ ابتدا میں مسیحی اثر سے مذہبی نظمیں کہی گئیں ۔ قدیم ترین نظموں میں جنھیں رزمیہ کہا جا سکتا ہے 'ایگور' (Igor) کی مہم کے بارے میں ہیں ۔ یہ نظمیں سنہ ۱۱۸۵ع میں کہی گئیں ۔ مصنف کے نام کا پتا نہیں چل سکا ۔ لیکن ان کے مسودات سنہ ۱۷۹۵ع میں دریافت ہوئے اور سنہ ۱۸۰۰ع میں یہ نظمیں شائع ہوئیں ۔ ان نظموں کو قدیم روسی ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے ۔ ان کے بعد منظوم داستانیں ہیں جنھیں 'بیلی نی' (Byliny) کہا جاتا ہے ۔ ان نظموں میں تاریخی اور نیم تاریخی داستانیں بیان کی گئی ہیں ۔ ان کہانیوں میں جنگی سپاہیوں اور کمانڈروں کی فتوحات کے قصے ہیں جو زیادہ تر بادشاہ ولادی میر (Vladimir) کے گرد گھومتے ہیں ۔ اس کے بعد اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع کے مشہور شاعر دینی داوی دوف

(۱) عربی ادب کے بارے میں ان معلومات کے لیے میں عطا حسین صاحب کا ممنون ہوں ۔

(Denis Devydov) نے جنگ اور محبت کے موضوع پر بہت سی نظمیں لکھیں ۔

فرانسیسی ادب :

فرانسیسی ادب کی ابتدا بارھویں صدی کے 'رولاں کا گیت' (La Chanson de Rolland) سے ہوتی ہے ۔ اس طویل نظم کا ہیرو ایک جنگجو بہادر سپاہی رولاں ہے ۔ یہ نظم دراصل صلیبی جنگوں میں فرانسیسیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کی ترغیب دینے کے لیے کہی گئی تھی ۔ اس نظم میں ہیرو رولاں کی فتوحات کے قصوں کے علاوہ مسلمانوں کے "مظالم" کا بھی ذکر ہے جو انھوں نے فرانسیسیوں پر کیے تھے ۔ مثلاً ایک جگہ مسلمانوں کے پیرس پر "حملہ" کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ واقعات محض فرضی تھے اور انھیں بیان کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف جذبات کو ابھارا جائے ۔ لیکن کہیں کہیں مسلمانوں کی شجاعت کی تعریف بھی کی گئی ہے ۔

اردو ادب :

اردو ادب میں جنگ کے موضوع پر بہت سی نظمیں موجود ہیں ۔ لیکن اس صنف میں سب سے زیادہ اہم وہ مرثیے ہیں جو کربلا کی جنگ کے المیے کے بارے میں

لکھے گئے ۔

سنہ ٦١ ہجری میں جناب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرت امام حسین بن حضرت علی کو حاکم وقت یزید بن معاویہ کی فوج نے کربلا کے میدان میں شہید کر دیا کیوں کہ امام حسین نے یزید کی اطاعت کرنے سے انکار کیا تھا ۔ اس واقعے میں الم کا پہلو یہ ہے کہ امام حسین کے ساتھ سو سے بھی کم افراد تھے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسین جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ یزید کے بارے میں امام حسین کی رائے کو صحیح یا غلط تصور کیا جاسکتا ہے لیکن اظہار رائے کی آزادی کو اس واقعے میں جس طرح کچل دیا گیا وہ ان تمام اقدار کی نفی کرتا ہے جن کی تائید آسمانی صحیفوں سے لے کر اقوام متحدہ کے منشور تک تہذیب انسانی کی تاریخ میں ہمیشہ کی جاتی رہی ہے ۔ اس لیے مشرق اور مغرب کے مورخین اس بارے میں متفق ہیں کہ امام حسین اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ جس ظلم اور بربریت کا سلوک کیا گیا وہ تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے ۔ اس المیے کے موضوع پر اردو زبان کی ابتدا سے اب تک سیکڑوں مرثیے لکھے گئے ہیں جن میں کربلا کی جنگ ، امام حسین اور ان کے ساتھیوں کی حق پسندی اور مظلومیت کا ذکر نہایت مؤثر انداز میں کیا گیا ہے ۔ ان مرثیوں میں

انیس اور دبیر کے مرثیوں کا خاص مقام ہے۔ جنگ کے المیہ پہلو پر جتنا ادب واقعۂ کربلا کے موضوع پر ہے اتنا دنیا کی کسی دوسری زبان میں یا کسی دوسرے المیے کے بارے میں شاید ہی کہیں ملے۔

سنسکرت ادب :

سنسکرت ادب کی سب سے مشہور رزمیہ نظم 'مہا بھارت' ہے جس میں کورو اور پانڈو کی جنگ کی داستان ہے۔ اس کتاب میں خیر و شر اور دیگر اخلاق قدروں اور تصورات پر فلسفیانہ بحثیں کی گئی ہیں۔

فارسی ادب :

فارسی ادب کی مشہور ترین رزمیہ نظم "شاہ نامہ" ہے جو فردوسی نے سنہ ۱۰۱۰ع میں مکمل کی۔ یہ نظم ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم کا مواد فردوسی سے پہلے دقیقی اور دیگر اہل علم نے جمع کیا تھا۔ اس کا موضوع ایران، خصوصاً سیستان کے بادشاہوں، پہلوانوں اور سپاہیوں کے کارناموں کی وہ داستانیں ہیں جو عرصۂ دراز سے مشہور تھیں۔ اس نظم کے کردار رستم، سہراب وغیرہ نے عالمگیر شہرت حاصل کی اور دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں بھی ان کرداروں کا ذکر ملتا ہے۔

انگریزی ادب :

انگریزی ادب میں دو رزمیہ نظمیں بہت مشہور ہیں۔ ایک ایڈمنڈ اسپنسر کی Faerie Queen جو سولہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ۔ اور دوسری ملٹن کی "فردوس گم گشتہ" (Paradise Lost) جو سترھویں صدی میں لکھی گئی اور دنیا کے عظیم ترین ادب میں شمار ہوتی ہے۔ فیری کوئین ایک مجازیہ (Allegory) کے انداز میں لکھی گئی جس میں اخلاقی قدروں سے بحث کی گئی ہے ۔ اور فردوس گم گشتہ انسان کی عظمت اور پھر اس کے زوال کی داستان ہے جس کے ماخذ انجیل مقدس اور دوسری مذہبی کتابیں ہیں ۔

امریکی ادب :

امریکی ادب تقریباً ۳۰۰ سال پرانا ہے ۔ قدیم امریکی ادب میں رزمیہ شاعری کی کوئی قابل ذکر روایت موجود نہیں ۔ "سرخ ہندوستانیوں" سے لڑائیوں کی کہانیاں ضرور لکھی گئی ہیں ، لیکن ہمیں کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جس کی شاعری امریکی ادب کا اہم جزو بن گئی ہو ۔ البتہ جنگ کے موضوع پر ناولیں لکھی گئی ہیں جن میں غالباً سب سے زیادہ مقبول ناول "Gone With the Wind" ہے جو امریکہ کی خانہ جنگی کے موضوع پر ہے ۔ یہ خانہ جنگی

... ریاستوں میں ہوئی ... اس کا سلسلہ
... ء تک جاری رہا۔

... ادب

... ادب چینی تمدن کی طرح بہت قدیم ہے۔ قدیم ... چو یوان نے جنگ کے موضوع پر نظمیں لکھی ہیں۔ چو یوان سنہ ۳۴۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چین کی ریاستوں میں، ایک دوسرے پر تسلط کے لیے لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ چو یوان نے زیادہ تر جنگ کے المیے پر نظمیں لکھی ہیں جن میں ملک کے لیے جان دینے والے سپاہیوں پر اس کا لکھا ہوا مرثیہ بہت مشہور ہے۔ چو یوان کی شاعری دو ہزار سال سے زیادہ قدیم ہونے کے باوجود ابھی تک مقبول ہے۔

ایک اور مشہور قدیم شاعر جس نے جنگ کے موضوع پر نظمیں لکھی ہیں تو فو ہے۔ توفو سنہ ۷۱۲ء میں پیدا ہوا۔ وہ تانگ نسل کے بادشاہوں (سنہ ۶۱۸ء تا ۹۰۷ء) کے زمانے کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ چینی تاریخ کا یہ دور ادب اور دیگر فنون لطیفہ کی ترقی کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس زمانے میں قدیم جاگیرداریوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ چو یوان کو جنگ ناپسند تھی چناں‌چہ اس نے جنگ کی تباہیوں پر

بہت کچھ لکھا ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی اعتراف کیا کہ اکثر اوقات جنگ ناگزیر ہوتی ہے ۔ جنگ کے موضوع پر اس کی سب سے زیادہ مشہور پانچ نظمیں ہیں جن کا عنوان ہے "سرحدوں کی کہانیاں" ۔ اس نے سنہ ۷۵٦ع کی چنناد کی لڑائی پر بھی ایک نظم لکھی جو بہت مقبول ہوئی[1]۔

رزمیہ شاعری پر ایک نظر :

جنگ سے متعلق قدیم کلاسیکی نظموں کو اردو میں رزمیہ نظمیں کہا جاتا ہے ۔ ''رزمیہ نظم" انگریزی اصطلاح Epic poetry کا ترجمہ ہے ۔ آکسفرڈ ڈکشنری کے مطابق "ایپک" اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ایک یا ایک سے زیادہ ہیروؤں کے کارنامے مسلسل بیان کیے جائیں ۔ فرانسیسی زبان کی "لاروس" کے مطابق رزمیہ نظم (Lpopee) ایک طویل رجزیہ نظم کو کہتے ہیں جس میں عجیب اور عظیم واقعات بھی بیان کیے جائیں ۔ انگریزی نقادوں نے

---

(۱) چو یوان اور توفو کی منتخب نظموں کے انگریزی ترجمے Foreign Languages Press, Peking سے شائع ہوچکے ہیں ؛ چویوان کی نظموں کا مجموعہ سنہ ۱۹۵۳ع میں اور توفو کا مجموعہ سنہ ۱۹٦۴ع میں ۔

اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ ایک ایپک مسلسل نظم ہے جس میں ایسے واقعات بیان کیے جائیں جو کسی وجہ سے اہم اور عظیم ہوں اور جن میں عمل اور خصوصاً تشدد، مثلاً جنگ کا ذکر ہو[1]۔

ان تعریفوں سے رزمیہ نظم کی نوعیت کافی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ رزمیہ نظم کا اہم موضوع جنگ ہے، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ اگر جنگ کا ذکر نہ ہو تو وہ نظم رزمیہ نہ کہلائے۔ مثلاً ملٹن کی "فردوس گم گشتہ" کا موضوع جنگ نہیں، لیکن وہ دنیا کی اہم ترین رزمیہ نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ بعض نقاد دانتے کی "طربیۂ آسمانی" کو بھی رزمیہ نظم قرار دیتے ہیں، حالانکہ اس کا موضوع بھی جنگ نہیں۔ لیکن گزشتہ صفحات میں مختلف زبانوں کی رزمیہ نظموں کے تذکرے سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ رزمیہ نظموں کا موضوع زیادہ تر جنگ ہی تھا۔ دراصل رزمیہ نظم کا موضوع "انسان" اور اس کی عظمت ہے۔ اور چوں کہ شجاعت انسان کی عظمت کا اہم عنصر ہے اور شجاعت کا اظہار جنگ میں زیادہ نمایاں طور پر ہوتا ہے اس لیے جنگ رزمیہ نظم کا

(۱) ملاحظہ ہو : "From Vergil to Milton" مصنفہ C. M. Bowra صفحہ ۱ ۔

۱۵ منٹ

شکست خوردہ مایوس سپاہی کی موت :

ماتیو لڑائی میں گھائل ہو چکا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ وہ صرف پندرہ منٹ اور زندہ رہے گا ۔ سارتر لکھتا ہے :

"میرے خدا !" وہ چلایا ۔ "میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ ہم پندرہ منٹ مدافعت نہ کر سکے ۔" وہ دمدمے پر پہنچا اور اس نے فائرنگ شروع کر دی ۔ یہ فائرنگ ایک قسم کا انتقام تھا ان نا کردہ گناہوں کا جن کی حسرت وہ دل میں لیے جا رہا تھا . . . "ایک فائر لولا کی یاد میں جسے میں حاصل نہ کرسکا ۔ ایک مارسل کے نام پر جسے مجھے تنہا چھوڑ دینا چاہیے تھا ۔ ایک اودیت کے لیے جسے میں نے کبھی پیار کرنا نہیں چاہا ۔ ایک ان کتابوں کے واسطے جنھیں لکھنے کی میں جرأت نہ کر سکا ۔ یہ ان سفروں کے سلسلے میں جو میں نہ کرسکا ۔ اور یہ ان سب لوگوں کے نام پر جن سے میں نفرت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے بجائے میں نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی ۔" وہ فائرنگ کر رہا تھا اور اخلاق قانون کی دھجیاں بکھر رہی تھیں ——

"اپنے پڑوسی سے محبت کرو" . . . ٹھائیں
"کسی کی جان مت لو" . . . ٹھائیں
. . . وہ انسان ، نیکی ، آزادی . . . سب پر
گولی چلا رہا تھا . . . اس کا سر جل بھن
گیا تھا ۔ ہر طرف ہوا میں گولیاں چل رہی
تھیں ۔ "دنیا دھواں بن کر اڑ رہی ہے ۔ میں
بھی اس کے ساتھ دھواں بن کر اڑ رہا ہوں ۔"
اس نے فائر کیا اور گھڑی دیکھی ۔ چودہ
منٹ تیس سیکنڈ . اب مجھے قسمت سے کچھ
نہیں مانگنا ہے ۔ مجھے صرف نصف منٹ چاہیے
. . . تاکہ میں اس افسر کو ماروں جو گرجے
کی طرف بھاگا جا رہا ہے . . . اس نے افسر پر
فائر کیا . . . اس نے دنیا کے حسن پر فائر کیا
. . . اس نے کوچہ و بازار ، پھول اور باغ
اور ہر اس چیز پر فائرنگ کی جسے وہ چاہتا
تھا ۔ اب حسن سر نگوں ہو چکا تھا ، لیکن
ساتیو فائرنگ کیے جا رہا تھا — اب اس کی
روح پاک ہو گئی تھی — اب وہ طاقتور تھا
— اب وہ آزاد ہو چکا تھا ۔

پندرہ منٹ ! ! !"

اہم موضوع بن گئی ۔ میرا خیال ہے کہ تمام اہم رزمیہ نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں ۔

رزمیہ نظمیں دنیا کے قدیم اور کلاسیکی ادب میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں ۔ دنیا کی کئی قوموں کے ادب کی ابتدا رزمیہ نظموں ہی سے ہوتی ہے ۔ ان میں سے بعض رزمیہ نظمیں صرف گائی جاتی تھیں یا سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں ، لکھی نہیں گئی تھیں ۔ ان رزمیہ نظموں میں یونان کی ایلیڈ اور اڈیسی، فرانس کی رولاں کا گیت ، جرمنی کی بوولف شامل ہے ۔ دوسری قسم کی وہ نظمیں ہیں جو ضبط تحریر میں آئیں اور پڑھی جاتی رہیں ۔ ان میں لاطینی ادب کی اینیڈ پرتگیزی کی Os Lusiados انگریزی کی فردوس گم گشتہ اور فارسی کا شاہ نامہ وغیرہ شامل ہیں ۔ زیادہ تر رزمیہ نظمیں (اور خصوصاً سینہ بہ سینہ رزمیہ نظمیں) تفریحی مقاصد کے لیے گائی جاتی تھیں ۔ لیکن دور جدید میں ان نظموں کی اہمیت کے چار پہلو ہیں ۔ پہلا یہ کہ ان میں سے بیشتر نظمیں قدیم تاریخ کے بعض ایسے گوشوں کو روشن کرتی ہیں جن کے بارے میں کوئی اور ماخذ مورخین کو نہیں ملتا ۔ محتاط مورخین نے قیاس کی مدد سے ان نظموں کو سامنے رکھ کر اکثر مفید نتائج اخذ کیے ہیں ۔ دوسرا یہ کہ ان نظموں میں الفاظ کا نہایت بیش قیمت ذخیرہ ملتا ہے ۔ تیسرا یہ کہ ان نظموں میں اس کی دور کی معاشرت اور

تمدن کی جامع تصویر ملتی ہے ۔ اور چوتھا یہ کہ ماہرین نفسیات کو ان نظموں سے انسانی ذہن کے ارتقائی منازل کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے اور قدیم دیومالا اور اساطیر کے کرداروں سے متعلق تصورات کا تجزیہ کر کے ذہن انسانی کی بعض الجھنوں کو سلجھانے کے لیے مواد حاصل ہوتا ہے ۔

مندرجہ بالا بیان میں جنگ کے بارے میں قدیم اور کلاسکی ادب پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے ۔ جنگ کے موضوع پر قرون وسطٰی اور عہد جدید میں بھی بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے ۔ طالسطائی کی "جنگ اور امن" ، شولوخوف کی "اور ڈان بہتا رہا" اس موضوع کی بہترین ناولوں میں سے ہیں ۔ اس کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں نے بھی جنگ سے متاثر ہوکر بہت کچھ لکھا ہے ۔ ژاں پال سارتر نے "آزادی کی راہیں" کے سلسلے میں تین ناول لکھے ہیں ، جن کا موضوع بالواسطہ یا بلا واسطہ عالمی جنگ ہے ۔ جنگ اب بھی ادب کا اہم موضوع ہے لیکن اب اس موضوع پر سوچنے اور لکھنے کا انداز بالکل بدل گیا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک انداز ملاحظہ فرمائیے ۔ ژاں پال سارتر نے اپنی ناول La Mort dans l'ame میں ایک شکست خوردہ مایوس سپاہی ماتیو کی موت اس طرح بیان کی ہے :

۱۵ منٹ

شکست خوردہ مایوس سپاہی کی موت :

ماتیو لڑائی میں گھائل ہو چکا ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ وہ صرف پندرہ منٹ اور زندہ رہے گا ۔ سارتر لکھتا ہے :

"میرے خدا !" وہ چلایا ۔ "میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ ہم پندرہ منٹ مدافعت نہ کر سکے ۔" وہ دمدمے پر پہنچا اور اس نے فائرنگ شروع کر دی ۔ یہ فائرنگ ایک قسم کا انتقام تھا ان ناکردہ گناہوں کا جن کی حسرت وہ دل میں لیے جا رہا تھا . . . "ایک فائر لولا کی یاد میں جسے میں حاصل نہ کرسکا ۔ ایک مارسل کے نام پر جسے مجھے تنہا چھوڑ دینا چاہیے تھا ۔ ایک اودیت کے لیے جسے میں نے کبھی پیار کرنا نہیں چاہا ۔ ایک ان کتابوں کے واسطے جنھیں لکھنے کی میں جرأت نہ کر سکا ۔ یہ ان سفروں کے سلسلے میں جو میں نہ کرسکا ۔ اور یہ ان سب لوگوں کے نام پر جن سے میں نفرت کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے بجائے میں نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی ۔" وہ فائرنگ کر رہا تھا اور اخلاق قانون کی دھجیاں بکھر رہی تھیں——

"اپنے پڑوسی سے محبت کرو" ... ٹھائیں
"کسی کی جان مت لو" ... ٹھائیں
... وہ انسان، نیکی، آزادی ... سب پر
گولی چلا رہا تھا ... اس کا سر جل بھن
گیا تھا - ہر طرف ہوا میں گولیاں چل رہی
تھیں - "دنیا دھواں بن کر اڑ رہی ہے - میں
بھی اس کے ساتھ دھواں بن کر اڑ رہا ہوں -"
اس نے فائر کیا اور گھڑی دیکھی - چودہ
منٹ تیس سیکنڈ - اب مجھے قسمت سے کچھ
نہیں مانگنا ہے - مجھے صرف نصف منٹ چاہیے
... تاکہ میں اس افسر کو ماروں جو گرجے
کی طرف بھاگا جا رہا ہے ... اس نے افسر پر
فائر کیا ... اس نے دنیا کے حسن پر فائر کیا
... اس نے کوچہ و بازار، پھول اور باغ
اور ہر اس چیز پر فائرنگ کی جسے وہ چاہتا
تھا - اب حسن سر نگوں ہو چکا تھا، لیکن
ماتیو فائرنگ کیے جا رہا تھا — اب اس کی
روح پاک ہو گئی تھی — اب وہ طاقتور تھا
— اب وہ آزاد ہو چکا تھا -

پندرہ منٹ ! ! !"

دوران جنگ میں تخلیق کردہ ادب :

عموماً جنگ کے بارے میں جو عظیم ادب دنیا کی مختلف زبانوں میں ملتا ہے وہ جنگ کے دوران میں نہیں بلکہ جنگ کے بعد تخلیق کیا گیا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ زندگی کے بیشتر اہم واقعات کا جائزہ ادیب اسی وقت لیتا ہے جب وہ واقعہ گزر چکا ہو ۔ ادیب زندگی کے مسائل کو آفاقی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور تمدن پر اس کے مجموعی اثرات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے ۔ یہ عام طور پر اسی وقت ممکن ہے جب وہ اضطراری کیفیت ختم ہو جائے جو واقعے سے وقتی طور پر پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن ایسے ادبی شہپارے بھی موجود ہیں جو جنگ کے دوران میں تحریر کیے گئے اور انہیں ابدی حیثیت حاصل ہوئی ۔ دوران جنگ میں عظیم ادب اسی وقت تخلیق کیا جا سکتا ہے جب فن کار کی نظر ان بنیادی آفاقی حقائق اور اقدار پر ہو جو جنگ کے محرک اور جنگ کی تباہ کاری سے متاثر ہوئے ۔

موجودہ جنگ اور ادیب :

ہندوستان اور پاکستان کی جنگ میں پاکستان کے ادیبوں کا موقف بہت سیدھا سادا ہے ۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ۔ عام طور پر ادیب اپنے گرد و پیش کے ہونے والے واقعات اور نظریات سے مطمئن نہیں ہوتا ۔ وہ

اکثر اوقات زندگی سے مصالحت نہیں کر سکتا ۔ ادیب اکثر بغاوت کرتا ہے ۔ اسی لیے اکثر اوقات ادیبوں نے جنگ اور سیاسی آویزشوں میں ملک کے ارباب اقتدار سے شدید اختلاف کیا ۔ مثلاً ژاں پال سارتر نے اپنے وطن فرانس کی پالیسی کے خلاف الجیریا کے مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے لیے جنگ میں حصہ لیا ۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے معاملے میں پاکستان کا کوئی ادیب اور کوئی ہوشمند انسان ایسا نہیں جو اس بات پر یقین نہ رکھتا ہو کہ ہندوستان کا موقف ان تمام اقدار کی نفی کرتا ہے جن کی تائید ادب نے ہمیشہ کی ہے ۔ یہ جنگ دنیا کی جنگوں کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے ۔ دنیا کی زیادہ تر لڑائیاں تسلط اور اقتدار کے لیے لڑی گئیں ۔ (بہانے مختلف تھے لیکن بات یہی تھی) لیکن تاریخ عالم میں یہ پہلی جنگ ہے جو اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ ایک ملک کی حکومت نے دنیا میں بدعہدی اور تضاد کی عجیب و غریب مثال پیش کی ہے ۔ اس ملک کی حکومت نے خود اپنے آپ کو بارہا جھٹلایا ہے ۔ اس نے ایک اصول (تقسیم ہند) کو پہلے قبول کیا ، پھر اس سے انحراف کیا ۔ پہلے پچاس لاکھ انسانوں کو حق خود ارادیت دینے کا وعدہ کیا ، پھر اس سے پھر گیا ۔ پہلے اس مسئلے کو لے کر خود عالمی ادارے میں پہنچا اور اس کی تجویز سے اتفاق

کیا ، پھر اسے یکسر نظرانداز کر دیا ۔ دنیا کے سیاست دان اور مفکر (برٹرنڈ رسل وغیرہ) اس ملک کی حکومت کی ہٹ دھرمی اور بربریت کو دیکھ کر چیخ اٹھے۔ دنیا کی تمام قوموں نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے لیکن اس ملک نے کہا کہ یہ مسئلہ ہی موجود نہیں ۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے ؟ ایک ملک صحیح اور دنیا کے سارے ممالک غلط نہیں ہوسکتے ۔ یہ ملک انسانیت کی توہین کر رہا ہے ۔ یہ ملک تہذیبی اقدار کے اس سرمائے کو برباد کر رہا ہے جو انسانی تمدن کی تاریخ نے پانچ ہزار سال میں جمع کیا تھا ۔ اور اگر دنیا کی بڑی طاقتوں نے یہ سرمایہ برباد ہونے دیا تو انسانیت کو اس سے ایسا نقصان پہنچے گا کہ اس کے سامنے جوہری بم کی تباہ کاریاں بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گی ۔

ایک نامعلوم سپاہی :

دنیا کی مشہور لڑائیوں میں قوموں اور ان کے ادیبوں نے مشہور سورماؤں کو خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ حکومتوں نے انھیں اعزازات عطا کیے ۔ ادیبوں اور شاعروں نے ان کے کارنامے بیان کرکے انھیں حیات جاوداں بخش دی ۔ ان کے نام و نشان جریدۂ عالم پر ہمیشہ ثبت رہیں گے ۔ لیکن اس وقت میں ایک ایسے سپاہی کو خراج

عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا نام میں نہیں جانتا ۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس گمنام سپاہی نے قوم کے لیے اپنی جان دی ۔ یہ سپاہی تاریخ عالم کی ہر جنگ میں موجود تھا لیکن اس کا نام کبھی نہیں لیا گیا ۔ یہ سپاہی سکندر کی فوج میں تھا لیکن یونان کے مؤرخین نے جنگ ناموں میں اس کا ذکر نہیں کیا ۔ یہ سپاہی ٹرائے کے محاصرے میں لڑا لیکن ہومر کی رزمیہ نظموں میں اس کا ذکر نہیں ملتا ۔ اس گمنام سپاہی نے روم کے فرماں رواؤں کے لیے جنگ کی اور عہد عتیق کے جاں بازوں کی یاد تازہ کر کے جان دی ، لیکن ورجل نے اینیڈ میں اسے نظرانداز کیا ۔ اس سپاہی نے حسین ابن علی کے ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا لیکن مراثی انیس و دبیر میں مجھے اس کی شہادت کا بیان نہیں ملا ۔ رستم اور افراسیاب کے عہد میں بھی اس سپاہی نے شجاعت دکھائی اور جان دی لیکن فردوسی نے سیستان کے سورماؤں میں اس غریب سپاہی کا ذکر نہیں کیا ۔ یہ سپاہی موجودہ جنگ میں بھی موجود تھا ۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ مغربی پاکستان کے کسی غیرمعروف قصبے کا رہنے والا تھا یا مشرقی پاکستان کے کسی پس ماندہ علاقے کا ایک سادہ لوح ماہی گیر تھا ، جس نے جنگ میں قوم کی آواز پر لبیک کہا ۔ جب وہ محاذ پر جا رہا تھا تو اس کی ماں نے دامن پھیلا کر اسے

دعا دی ہوگی ۔ اس کی بہن نے اس کی ہمت بندھائی ہوگی اور اس کی بیوی نے خدا حافظ کہہ کر خاموشی سے چند آنسو اس کی نذر کیے ہوں گے . . . یا ممکن ہے اسے رخصت کرنے والا کوئی نہ ہو ۔ اس نامعلوم سپاہی نے اپنے وطن کی فوج میں شامل ہو کر دوسرے شہیدوں کے ساتھ جان دی ۔ اس کی موت کی اطلاع پر اس کی ماں ، بہن اور بیوی اور دوست روئے ہوں گے . . . یا ممکن ہے کہ اس کی موت پر رونے والا بھی کوئی نہ ہو کیونکہ یہ سپاہی گمنامی میں پیدا ہوا تھا ؛ گمنامی میں زندہ رہا ، اور گمنامی ہی میں مر گیا ۔ گمنامی اس کا مقسوم تھی : اس کے جینے کی ادا یہی تھی ۔ اس کی زندگی :

"عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند"

کی تفسیر تھی ۔ وہ نام سے بے نیاز رہا ۔

اس گمنام اور نامعلوم سپاہی کو انسان نے وقتاً فوقتاً خراج عقیدت پیش کیا ہے ۔ انگلستان کے ٹامس گرے نے اپنے مشہور مرثیے میں اس کی گمنام موت پر آنسو بہائے ہیں ۔ مورخین اس کے نام سے ناواقف رہے اور ناواقف رہیں گے ، لیکن روحِ تاریخ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی ۔ میں اس نامعلوم سپاہی کو سلام کرتا ہوں ۔

اهل قلم اور اہل تحقیق حضرات کی خدمت میں چند معروضات

اردو زبان تین صدیوں سے زیادہ عرصے سے اس برصغیر کی ثقافتی زبان ہے اور اس عرصے میں اردو نے بولی، زبان اور ادب کی تینوں ارتقائی منازل طے کر لی ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی میں اردو اس منزل میں داخل ہوئی جو کسی قوم کے ثقافتی مظاہر کی اعلیٰ اور اہم ترین منزل ہوتی ہے، یعنی تحقیق کی منزل۔ اس صدی کی ابتدا میں اردو زبان کے اہل قلم میں تحقیق کا اعلیٰ شعور پیدا ہوا۔ تذکرہ نویسی کی جگہ تاریخ نویسی نے لی۔ پھر گزشتہ بیس پچیس سال میں ادیبوں نے ادب کا جائزہ لینے کے لیے محض انفرادی رائے کے اظہار کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے لیے حتی الوسع کچھ معیار اور ضوابط معین کرنے کی کوشش کی اور اس طرح تنقید اور اصول تنقید کے مسائل پر بہت کچھ لکھا گیا۔ اس کے بعد خصوصاً آزادی کے چند سال بعد صحیح معنوں میں

یونیورسٹیوں میں تحقیق کی ابتدا ہوئی ۔ منظم تحقیقی کام جنگ سے پہلے یورپ کی بعض یونیورسٹیوں میں کیا گیا اور برصغیر کی بعض یونیورسٹیوں میں بھی چند گراں قدر مقالے لکھے گئے لیکن برصغیر کی یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام تیزی کے ساتھ آزادی کے بعد ہی شروع ہوا اور تحقیقی مقالے لکھے گئے ۔ بعض لوگوں کی رائے میں ان میں سے بعض مقالے تحقیق کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے جس کی توقع عالمی ادب کے اس دور کے محققین سے کی جا سکتی ہے ۔ لیکن ایسے مقالے بھی لکھے گئے ہیں جن میں تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے اور ان کے مصنفین نے بین الاقوامی معیار کے مطابق "افق علم کو وسیع تر کیا ہے ۔" یہ سب ہمارے اہل قلم اور اہل تحقیق کا فیضان ہے جس کے لیے اردو زبان و ادب کا ہر طالب علم ان حضرات کا ممنون ہے ۔

اب جب کہ اردو زبان تحقیق کی منزل میں داخل ہو چکی ہے ، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کا معیار قائم کیا جائے ، علمی دیانت کے کچھ اصول وضع کیے جائیں اور تحقیق کی صحیح روایات برقرار رکھی جائیں ۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ زبان کے طالب علموں کی مشکلات بھی اہل تحقیق کے پیش نظر رہا کریں اور وہ کبھی کبھی خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیا کریں ۔

اس مضمون میں میں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے
کچھ اسی قسم کی جسارت کروں گا ۔

حقیقت اور رائے :

تحقیق حقیقت کی جستجو ہے اور چوں کہ حقیقت اکثر پنہاں اور گریزاں رہتی ہے ، اس لیے اسے پانے کے لیے جستجو کرنا پڑتی ہے ۔ محقق کا سب سے اہم فرض اس حقیقت کی تسخیر اور نقاب کشائی ہے ۔ حقائق پر اظہار رائے محقق کا حق اور حصہ ہے لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ حقائق صحیح ہوں ۔ بعض تحقیقی مقالوں میں دیکھا گیا ہے کہ حقائق کی تلاش و بیان کے مقابلے میں اظہار رائے پر زیادہ زور قلم صرف کیا جاتا ہے ۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے آپ کو رائے کا اظہار نہایت خوب صورت اور پر شکوہ الفاظ میں ملے گا لیکن حقائق کی دریافت اور تحلیل و تجزیہ کے بارے میں نہایت سطحی قسم کی تحریریں ملیں گی ۔ ادبی تحقیق کے لیے بنیادی حقیقتیں بہت سی ہوتی ہیں جن کو سب سے پہلے تحقیق کا موضوع بنانا چاہیے ۔ مثلاً متن ہی کو لے لیجیے ، کتنے تحقیقی مقالے ایسے لکھے گئے ہیں جن میں شعرا (اور خصوصاً قدیم شعرا) کے کلام کے صحیح متن کے تعین کے بارے میں بحث کی گئی ہے ؟ شعرا کے کلام

کے مجموعے بار بار چھپتے ہیں لیکن ان کا متن دوسرے سے نہیں ملتا۔ بعض اہل تحقیق نے شعرا کے کلام کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے، لیکن اس میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ متن ادب کی اساس اور بنیادی حقیقت ہے، اگر یہی صحیح نہیں تو آپ تنقید و تبصرے پر ہزاروں صفحے تحریر فرما دیجیے، تحقیق کے معیار کے لحاظ سے اس کام کی زیادہ اہمیت نہیں۔

کیا نقاد کرام کسی شاعر کے کلام پر تنقید اور اظہار رائے سے پہلے اس کے متن کے صحیح تعین اور طباعت کی طرف زیادہ توجہ فرمانے کی زحمت گوارا کریں گے؟ ۱

(۱) شعرا کے مطبوعہ کلام میں کتابت کی غلطیوں اور صحیح متن کا تعین نہ کیے جانے سے ہمارے ادب کی تدریس میں کیا دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس لاپروائی سے ہمارے ادب کا معیار کس طرح متاثر ہو رہا ہے، اس کے بارے میں میرے عزیز دوست رالف رسل صاحب، ریڈر اردو، لندن یونیورسٹی نے ایک خط میں بحث کی ہے جو موصوف نے مجھے لکھا تھا اور جس کا ترجمہ سہ ماہی "اردو نامہ" کراچی بابت اکتوبر - دسمبر، ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔

غلط متن کیا کیا گل کھلا سکتا ہے، اس کی دل چسپ مثال حال میں میری نظر سے گزری ۔ماہنامہ "فاران" کراچی بابت اپریل، ۱۹۶۵ء کے شمارے میں اشفاق علی خان صاحب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

حوالے کی غلطیاں :

حوالہ تحقیق کی جان ہے ۔ جب کاوش و تلاش کے بعد محقق حقیقت تک پہنچتا ہے تو اس کا حوالہ

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
کی کتاب "جگر کی غزلیہ شاعری" پر تسکین قریشی صاحب کا ایک طویل تبصرہ شائع ہوا ہے ۔ زیر تبصرہ کتاب میں جگر کی شاعری کے نقائص بیان کیے گئے ہیں اور مصنف نے مثالیں دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جگر ناموزوں شعر کہتے تھے ۔ تسکین قریشی صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ جن اشعار کو اشفاق علی خان صاحب نے ناموزوں قرار دیا ہے وہ دراصل "شعلۂ طور" کے ناقص اڈیشن سے لیے گئے ہیں ۔ ان اشعار کا صحیح "شعلۂ طور" کے پہلے ایڈیشن ۱۹۳۲ء (مکتبہ جامعہ ، دہلی) اور ۱۹۵۰ء کے ایڈیشن (ادارۂ فروغ اردو ، لاہور) سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جگر کے یہ اشعار سہو کتابت سے کیا سے کیا ہوگئے اور ان کی "ناموزونیت" پر اشفاق صاحب نے ۳۰۰ صفحے کی کتاب لکھ ڈالی ۔ ع

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھیے !

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ رالف رسل صاحب کا خط اور تسکین قریشی صاحب کا یہ مضمون ملاحظہ فرما کر عبرت حاصل کریں ۔

دیتا ہے اور اس حوالے کی صحت پر اس کی قدر و قیمت کا بڑی حد تک دار و مدار ہوتا ہے ۔ میں نے یورپ میں اکثر محققین سے سنا کہ انہیں کسی تحقیقی مقالے کی اہمیت کا اندازہ اکثر اس کے فٹ نوٹ دیکھ کر ہو جاتا ہے ۔ ہمارے ادبی مقالہ نگاروں میں حوالہ اور فٹ نوٹ تحریر کرنے کی روایت نسبتاً زیادہ پرانی نہیں ہے ، اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔ حوالے کی غلطیاں جو عام طور پر نظر سے گزرتی ہیں ، وہ حسب ذیل ہیں :

بعض مقالوں اور کتابوں میں سرے سے حوالہ ملتا ہی نہیں ۔ پیرس میں قیام کے دوران میں مجھے ایک یورپی زبان کے ادب کی تاریخ کی کتاب ملی جو اردو میں لکھی ہوئی تھی ۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی خصوصاً اس لیے کہ کتاب برصغیر ہند و پاکستان کے ایک مشہور دانش ور نے لکھی تھی جن کے تبحر علمی کا میں ہمیشہ سے مداح ہوں ۔ میں نے کتاب شروع سے آخر تک پڑھی لیکن کہیں ایک حوالہ بھی نہیں ملا ۔ کنایۃً بھی نہیں لکھا گیا تھا جس سے اندازہ ہو سکے کہ تصنیف کے وقت کون کون سی کتابیں مصنف کی نظر سے گزریں ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ادب کی اس تاریخ کا تمام تر ماخذ مصنف کا ذہن تھا ؟ اگر دیگر مصنفین کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا تھا (جیسا کہ دیباچے میں اعتراف کیا

گیا ہے) تو کم از کم ان کتابوں کا ذکر کر دینے میں کیا مضائقہ تھا ؟ اسی طرح ابھی حال ہی میں یورپ کے فلاسفہ پر ایک کتاب میری نظر سے گزری جس میں کسی کتاب اور کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا تھا ۔ یہ طریق تصنیف تحقیق کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے ۔

دوسری قسم کی غلطی جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے ، وہ یہ ہے کہ مصنفین حوالہ تو دیتے ہیں لیکن اس معاملے میں زیادہ راست بازی سے کام نہیں لیتے ۔ مثلاً یہ کہ حوالے کے اصل ماخذ تک پہنچنے کی زحمت نہیں کرتے اور کسی دوسرے مصنف کے دیے ہوئے حوالے کو نہایت اطمینان سے نقل کر دیتے ہیں ۔ اس سہل انگاری سے دو نقائص پیدا ہوتے ہیں : ایک تو یہ کہ اصل ماخذ تک رسائی حاصل کیے بغیر اس کا حوالہ دینا علمی دیانت کے منافی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر سوے اتفاق سے (اور یہ سوے اتفاق اکثر دیکھنے میں آتا ہے) اس ماخذ کا حوالہ دیتے وقت ایک مصنف سے غلطی ہو گئی تو یہی غلطی حوالے کے ناقل مصنف صاحب سے بھی خود بخود سرزد ہو جاتی ہے کیوں کہ انھوں نے تو نقل کی ہے ، اصل تک تو پہنچے ہی نہیں ۔ اور اس طرح غلط نقل کی نقل ہوتی چلی جاتی ہے ۔

بعض صورتوں میں یہ ممکن ہے کہ محقق کی رسائی

اصل ماخذ تک نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ محقق اس کتاب کا حوالہ دے دے جہاں سے اس نے حوالہ نقل کیا ہے اور اس کا اعتراف کر لے کہ اصل ماخذ اس کی دسترس سے باہر تھا۔ اس اعتراف سے علمی دنیا میں اس کی دیانت اور راست بازی کو عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

تیسری دشواری حوالوں میں یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ حوالے غلط یا ناقص ہوتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حوالہ اور اقتباس واوین میں دیا جائے اور ماخذ کو مکمل طور پر ظاہر کیا جائے۔ بعض جگہ کتاب کا نام دے دیا جاتا ہے، مصنف کا نام نہیں دیا جاتا؛ بعض جگہ مصنف کا نام دیا جاتا ہے تو کتاب کا نام نہیں دیا جاتا۔ اور اگر یہ دونوں نام دیے جاتے ہیں تو کتاب کے صفحے کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ بہتر صورت یہ ہے کہ حوالے میں مصنف کا نام، کتاب کا نام اور صفحے کے ساتھ کتاب کا ایڈیشن، مطبع اور جائے اشاعت کا نام بھی تحریر کیا جائے تاکہ اہل تحقیق کو کتاب کی تلاش میں مدد ملے [۱]۔

---

(۱) برٹش میوزیم، لندن اور ببلیوتک ناسیونال، پیرس اور دنیا کے دیگر بڑے کتب خانوں میں جن حضرات نے کام

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور جو تھی قابلِ اعتراض جسارت وہ "دلیر" مصنفین کرتے ہیں جو کسی کتاب یا مضمون سے دل بھر کے استفادہ کرتے ہیں اور اس کا حوالہ دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ان حضرات کے لیے سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا انہیں نیک ہدایت دے!

دیگر زبانوں سے تراجم :

تحقیق میں تراجم کی بڑی اہمیت ہے۔ دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں ہے جس نے دوسری زبانوں کے تراجم سے اپنے ادب کو فروغ نہ دیا ہو۔ ہماری زبان میں بھی ترجمے اور بعض بہت اچھے ترجمے دیگر زبانوں سے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک بات سے غالباً ہم سب واقف ہیں کہ انگریزی، عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کو چھوڑ کر دوسری اہم زبانوں مثلاً روسی، فرانسیسی، جرمن وغیرہ زبانوں کے بہتر "تراجم"

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ بعض اوقات کتاب کا کیٹلاگ نمبر معلوم کرنے میں بہت وقت لگتا ہے اس لیے میں اپنے مضامین میں بعض جگہ کم یاب کتب کا حوالہ دیتے وقت کتب خانہ اور اس کے کیٹلاگ نمبر کا حوالہ بھی دے دیا کرتا ہوں تاکہ محقق کا وقت بچایا جا سکے۔

ایسے ہیں جو دراصل ان زبانوں سے واسطہ اردو میں منتقل نہیں کیے گئے بلکہ زیادہ تر انگریزی زبان کے توسط سے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں ۔ یعنی اصل زبان سے انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا اور ہمارے انگریزی‌دان اہل‌قلم نے اس کا اردو میں ترجمہ کر دیا اور کہیں یہ نہیں لکھا کہ یہ کتاب اصل کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کے انگریزی ترجمے کا ترجمہ ہے ۔ یہ بھی علمی اخلاقیات کے خلاف ہے۔ بعض موقر فرانسیسی کتابوں کے ایسے اردو "تراجم" میری نظر سے گزرے ہیں جن کا پہلا صفحہ پڑھ کر اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ فاضل مترجم فرانسیسی زبان سے نابلد تھے لیکن انھوں نے کہیں اس کا اعتراف نہیں کیا ۔ اب ہمارے ملک میں ایسے اہل قلم موجود ہیں جو بیرونی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں ، اس لیے اب اصل زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنا اتنا دشوار نہیں رہا ۔ لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو اور انگریزی زبان کے ترجمے سے ترجمہ کرنا ناگزیر ہو تو اصولاً یہ ضروری ہے کہ انگریزی کتاب کے نام ، مصنف اور ایڈیشن کا حوالہ صاف طور پر اردو ترجمے کے دیباچے میں دے دیا جائے ۔

استاد کو شاگرد کا "عطیہ" :

قدیم شعرا میں یہ روایت موجود تھی کہ اساتذہ اپنے

محبوب شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے ساتھ کبھی کبھی اپنے اشعار بھی شاگردوں کے دیوان میں شامل کر دیتے تھے جن کا اعتراف ان کے شاگرد کبھی کبھی محفلوں میں "عطیۂ استاد" کہہ کر کیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل یہ روایت کچھ الٹ گئی ہے۔ ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی کتاب کسی بڑے "استاد" کو لکھنے کے لیے دی گئی؛ استاد صاحب "عدیم الفرصت" ہونے کی وجہ سے خود یہ کام سرانجام نہ دے سکے اور انھوں نے یہ کام اپنے شاگرد کے سپرد کر دیا۔ شاگرد نے کتاب لکھی، استاد صاحب نے اتمام حجت کے لیے "نظر ثانی" فرمائی (یا بعض اوقات اس کی بھی زحمت نہیں کی) اور کتاب اپنے نام سے شائع کرا دی۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ بکی (کیونکہ بعض جگہ نام بکتا ہے، کام نہیں بکتا) بعد میں معلوم ہوا کہ کتاب ہر قسم کی اغلاط سے پر تھی، اور اس طرح تحقیق کا تماشا بن گیا۔ ایسی مثالیں بہت سی ہیں، نام گنوانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے اساتذہ اپنے شاگردوں سے اس قسم کا "عطیہ" قبول نہ فرمائیں تو کرم ہو گا۔

تنقید و تبصرہ نگاری :

عملی تنقید و تبصرہ نگاری تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے بلکہ بعض اوقات تنقید تحقیق کا ماحصل ہوتی ہے۔

اس لیے اس قدر بلند سطح کی تحریر کے لیے صاحب تحریر کو موضوع پر پوری دسترس ہونی چاہیے ۔ اس ربع صدی میں تنقید پر بہت کام ہوا ہے ۔ اس سلسلے میں ہم نے انگریزی ادب اور اس کے تنقید نگاروں کی تصانیف سے بہت استفادہ کیا ہے (بلکہ بعض حضرات نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی استفادہ کیا ہے) اس کا ہمیں کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیے ۔ بعض تنقیدیں یقیناً اعلیٰ پائے کی لکھی گئی ہیں اور ان میں ناقدین نے زیر تنقید تحریر کے حسن و قبح کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے ۔ لیکن اس دور کا طالب علم کسی تنقیدی مضمون سے جو توقعات وابستہ کرتا ہے ، ان میں حسب ذیل بھی شامل ہیں ۔

پہلے تو یہ کہ مضمون پڑھ کر معلوم ہو کہ یہ مضمون اردو زبان کے کسی ادیب کے کلام کے بارے میں ہے ، کسی انگریزی یا فرانسیسی ادیب کے بارے میں نہیں ۔ بلاوجہ دوسری زبانوں کے ادیبوں اور ناقدین کا ذکر نہ کیا جائے تو بہتر ہے ۔ دوسرے یہ کہ جو رائے بھی ظاہر کی جائے اس کے قائم کرنے کی وجہ مثال کے ساتھ ضرور بیان کی جائے ۔ اس دور کا طالب علم محاورے کے معاملے میں مان جائے تو مان جائے ، تنقید کے بارے میں کسی کے "فرمائے" ہوئے کو "مستند" نہیں مانتا ۔ وہ

تنقید کو (چاہے وہ کسی بڑے سے بڑے ناقد کی کیوں نہ ہو) ایک رائے سمجھنا ہے : نہایت قابل عزت رائے، لیکن بہر حال ایک رائے، قول فیصل نہیں ۔ وہ خود رائے قائم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے ناقدین کی رہنمائی چاہتا ہے، اور ناقدین کی رہنمائی اسی وقت با اثر ہو گی جب زیر تنقید موضوع پر مثالیں دے کر رائے کا اظہار کیا جائے اور ان پر سیر حاصل بحث کی جائے ۔ محض خوب صورت الفاظ اور چٹپٹے جملوں کا سہارا لے کر اظہار رائے مؤثر نہیں ہو گا ۔

مثالیں دے کر اظہار رائے ان تبصرہ نگار حضرات کے لیے بھی ضروری ہے جو کتابوں پر ریویو کرتے ہیں ۔ بعض ریویو پڑھ کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار صاحب نے کتاب پڑھنے کی زحمت ہی نہیں فرمائی ۔ فہرست مضامین پڑھ کر اپنی رائے داغ دی ہے ۔ تبصرے میں کوئی حوالہ نہیں، کوئی مثال نہیں ۔ نفس مضمون کے بارے میں کوئی بحث نہیں ۔ بس رائے ہی رائے ہے ۔ اس قسم کی رائے سے ممکن ہے زیر تبصرہ کتاب کا مصنف خوش (یا ناراض) ہو جاتا ہو لیکن کوئی ادبی مقصد حاصل نہیں ہوتا ۔ رسائل کے مدیر صاحبان بھی اگر تبصرہ شائع کرتے وقت ان باتوں کی طرف توجہ دیا کریں تو ادب کے طالب علموں کے حال پر بہت کرم ہوگا ۔

ادبی "سرمایہ دار" :

جیسا کہ میں نے مضمون کے شروع میں عرض کیا ، ہمارے بعض اہل قلم اور اہل تحقیق حضرات نے زبان اور ادب کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں اور سرمایۂ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے ۔ لیکن ان میں بعض ایسے حضرات بھی ہیں جن میں ایک خاص قسم کا واہمۂ برتری پیدا ہوگیا ہے اور ان کے انداز فکر و عمل میں وہی رعونت اور نخوت پیدا ہو گئی ہے جو عموماً سرمایہ داروں یا دوسرے بر خود غلط "بڑے" آدمیوں میں پیدا ہو جاتی ہے ۔ ان حضرات نے اوائل عمر میں کچھ قابل قدر تحقیقی کام کیا ، ان کا نام چمکا اور کچھ عہدے حاصل ہو گئے ۔ اس کے بعد ہلدا فراق بنی وبینک ، انھوں نے لکھنا پڑھنا تقریباً ترک کر دیا اور ایک انداز بے نیازی ہر بات میں اختیار کر لیا ۔ آپ انھیں خط لکھیں تو یہ "مصروف" ہونے کی وجہ سے جواب نہیں دیتے ۔ بات کریں تو یہ آپ کی نہیں سنتے ، اپنی ہی کہے جاتے ہیں ۔ کسی کتاب یا رسالے کو خریدنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں ۔ ادب کے ہر شعبے اور ہر موضوع پر اظہار رائے اس فیصلہ کن انداز سے کرتے ہیں جیسے اس میں کسی دوسری رائے کی گنجائش ہی نہیں ۔ یہ عموماً خود پڑھتے یا لکھتے نہیں بلکہ ان کی طرف سے یا ان کے

نام سے دوسرے پڑھتے اور لکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔ ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ براہ کرم دیگر "معمروفیات" کے علاوہ اگر کبھی کبھی کتب و رسائل کا مطالعہ بھی کر لیا کریں تو کیا مضائقہ ہے ۔

اس دور میں تحقیق کے اصول ، قواعد، معیار، اخلاقیات اور دیگر ادبی مسائل کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے ۔ یہ کام ترقی یافتہ ملکوں میں عظیم دانشوروں کی انجمنیں کرتی ہیں جیسے فرانس کی اکادمی ۔ اس قسم کی اکادمی قائم کرنے کی ضرورت ہمارے ملک میں بھی ہے لیکن خدشہ یہی ہے کہ اس پر بھی کہیں تن آسان "ادبی سرمایہ داروں" کا قبضہ نہ ہو جائے ۔ اس لیے جب تک اس قسم کی اکادمی قائم ہو یہ کام ادب کے "عوام" ہی کو کرنا ہوگا اور اس کی صورت یہی ہے کہ جب بھی کوئی ادبی تحریر یا تحقیقی کام اُن کی نظر سے گزرے وہ پہلے خود محنت کر کے اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ وہ تحقیق کے اصول ، قواعد اور معیار کے مطابق ہے یا نہیں اور اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں لکھی گئی ہے جو ادبی اخلاقیات اور روایات کے منافی ہے اور سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھیں کہ تحقیق میں حقیقت ہی کا مقام سب سے بلند ہے اور اگر انھیں کوئی قابل

گرفت بات نظر آئے تو اس پر بلا تامل اظہار خیال کریں ۔ یہ ایک اہم ذمہ داری ہے جسے پورا کرنا ضروری ہے ورنہ تحقیقی کام کا معیار بلند نہیں ہو گا بلکہ ممکن ہے رو بہ تنزل ہو جائے ۔

اہل تحقیق کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق کی ضرورت

میرا ایک مضمون بہ عنوان "اہل قلم اور اہل تحقیق حضرات کی خدمت میں چند معروضات" اس مجموعے میں شامل ہے ۔ مذکورہ مضمون میں اور باتوں کے علاوہ میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ ادبی تحقیق کا طریق کار جہاں تک ممکن ہو وہی ہونا چاہیے جو سائنس اور دیگر علوم میں تحقیق کا ہوتا ہے ۔ اور مثال کے طور پر چند اسقام کی طرف اشارہ کیا تھا جن کی وجہ سے ہمارے اکثر تحقیقی کاموں کا معیار بلند نہیں ہو رہا ہے ۔ سائنس کی تحقیقات عموماً تین منازل سے گزرتی ہیں :

۱ ۔ تحقیق : جس میں مشاہدہ ، تجربہ ، تحلیل ، استقرا ، استخراج وغیرہ شامل ہیں ۔

۲ ۔ پیش کش : جس میں تحقیق کے نتائج پیش کیے جاتے ہیں ، چاہے وہ تحریر کی صورت میں ہوں یا کسی ایجاد یا دریافت کی صورت میں ۔

۳ ۔ احتساب : تحقیق کے نتائج کا محاسبہ کیا جاتا ہے
تاکہ اس میں نظری اور عملی نقطہ' نظر سے اگر کوئی
خامیاں ہوں تو وہ اہل علم کے سامنے آئیں اور اس
پیش کش کے مختلف پہلوؤں پر مزید تحقیق کا کام شروع
کرکے علم کو اور وسعت دی جائے۔

زندگی کے ہر پیشے میں ترقی کے ساتھ ساتھ کچھ "اخلاقیات" کے اصول بھی متعین ہو جاتے ہیں جو اس کے مقاصد کی بقا کے لیے ضروری تصور کیے جاتے ہیں ۔ اکثر اوقات اخلاقیات کے یہ اصول کوئی حکومت متعین نہیں کرتی بلکہ متعلقہ افراد تجربات کی روشنی میں خود ہی چند روایات اور اصول متعین کر لیتے ہیں ۔ کچھ اسی قسم کے اصول سائنٹفک اور ہر قسم کی تحقیق کے لیے یورپ کے اہل علم میں مقبول ہیں ۔ ان اصولوں کی روشنی میں چند باتیں "تحقیق" کے بارے میں میں نے مذکورہ مضمون میں کہی تھیں۔ اس مضمون میں "پیش کش" اور "احتساب" کے بارے میں کچھ عرض کروں گا ۔

تحقیق کے نتائج کو "راز" نہ رکھا جائے :

جو لوگ علمی تحقیق کا کام کرتے ہیں ان کے علم میں اکثر ایسے حقائق آتے رہتے ہیں جو دیگر اہل علم کی دل چسپی کا باعث ہوں ۔ ایک علمی حقیقت اکثر بہت پہلودار ہوتی ہے اور اگر اس کے تمام پہلوؤں پر اوقات اس کے سب

مختلف پہلوؤں پر تحقیق کرنے کے لیے متخصصین (Specialists) ہوتے ہیں جن کے ہوتے ہوئے غیر متخصص کا اس موضوع پر کام کرنا علم کے مفاد کے منافی ہوتا ہے - ایسے موقع پر محقق کے سامنے دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ اپنی دریافت کو اس وقت تک راز میں رکھے جب تک کہ اس کے تمام پہلوؤں پر مکمل تحقیق کرنے کے قابل نہ ہو جائے اور یا اس کے علم میں جو کچھ آیا ہے اسے اہل تحقیق اور متخصصین کے سامنے پیش کر دے - آج کل سائنٹفک طریقہ اور اصول یہی ہے کہ دوسری صورت اختیار کی جائے یعنی حاصل تحقیق کو جلد از جلد اہل علم کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے -

اس اصول کے جواز میں کئی وجوہ ہیں - یہ دور تقسیم کار اور متخصصین کا دور ہے - ہر محقق کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتا - ایک ہی انسان کے لیے اخلاقیات ، تاریخ ، سیاسیات ، طبیعیات، نفسیات، فن شاعری، مابعدالطبیعیات اور دیگر علوم کا فاضل ہونا اور مستند کتابیں لکھنا ارسطو کے عہد میں ممکن تھا ، آئنسٹائن کے عہد میں ممکن نہیں - اور علوم و فنون کی ترقی کی رفتار جو ارسطو کے دور میں تھی ، اس کے مقابلے میں اس دور میں یہ رفتار کئی سو گنا زیادہ تیز ہے۔ ارسطو کے دور کا محقق کسی علم، کسی مسئلے کو اگر عرصے تک یا اپنی زندگی میں اہل علم

سے روشناس نہیں کراتا تھا اور یہ علم سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا تو اس سے علم کی دنیا میں بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا تھا۔ رسل و رسائل کے ذرائع محدود تھے۔ کسی خیال، کسی نظریے کی تشہیر کی وہ آسانیاں میسر نہیں تھیں جو آج ہیں۔ آج کا محقق اگر ایک مسئلے یا دریافت کو اہل علم اور متخصصین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے تو اسے کوئی دشواری نہیں۔ عالمی سطح پر کتابوں کی اشاعت ہے، اکادمیاں ہیں، سیمینار ہیں، علمی رسائل ہیں جو اس کے خیالات کو دنیا کے کونے کونے میں اہل علم تک لے جا سکتے ہیں۔ اور جب یہ علمی حقائق متخصصین کے علم میں آتے ہیں، وہ اس پر مزید تحقیق شروع کر دیتے ہیں اور کاروان علم تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ اس دور میں تحقیق کا عمل انفرادی نہیں رہا، یہ ایک اجتماعی کام ہے۔ سب اہل علم ایک دوسرے کو ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح سمجھتے ہیں اور ایک کے علم سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بہت کم ایسی سائنسی ایجادات ہیں جنہیں صرف ایک سائنس دان کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ریلوے، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی وژن جس شکل میں آج کل ہمارے سامنے ہیں کیا انہیں کسی ایک کی تحقیق کہا جا سکتا ہے؟ سائنس کی ایجادات اور انکشافات ارتقا کے اصول کے تابع ہیں اور یہ ارتقا اسی وقت ممکن ہے جب علمی تصورات کو ان کی

بقا اور نشو و نما کے لیے تازہ فضا ملتی رہے ۔ اور اس کے لیے ایک سے زیادہ افراد کے خیال آفریں دماغوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ سائنس کی سب ایجادات ابتدا میں ناقص اور خام ہوتی ہیں ۔ اگر سائنس‌دان انہیں دنیا کو پیش کرنے کے بجائے اس وقت تک انتظار کرے جب تک وہ ان کے تمام نقائص دور کر کے ان کو بدرجۂ کمال ترقی نہ دے ، تو سائنس کی ترقی کی رفتار رک جائے ۔ کیوں کہ انسان نے آج تک کوئی ایسی چیز نہیں بنائی جس میں اصلاح اور ترقی کی گنجائش نہ ہو ۔ اس لیے اصول یہی ہے کہ تحقیقی کام کے نتائج کو جلد سے جلد منظر عام پر لایا جائے تاکہ دیگر اہل‌علم اور متخصصین اس کام کو آگے بڑھا سکیں ۔

اس اصول کی وضاحت میں میں ایک مثال پیش کرتا ہوں ۔ فرض کیجیے کہ کسی ماہر آثار قدیمہ (جس کے معنی صرف اتنے ہیں کہ آثار قدیمہ سے متعلق متعدد علوم میں سے ایک علم سے واقفیت رکھنے والے) کو کسی مقام پر کوئی ہڈیوں کا ڈھانچا ، کوئی سکہ یا کوئی کتبہ ملتا ہے ۔ ایسے موقع پر محقق یہ انتظار نہیں کرتا کہ پہلے وہ علم تشریح اعضا ، علم‌الانسان ، انسانیات وغیرہ سب علوم سے واقفیت حاصل کرے ، پھر دریافت کی ہوئی شے کے بارے میں تحقیق کرے اور اس پر مقالہ لکھے ۔ وہ یہ کچھ نہیں کرتا : اس کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے اسے

متخصصین کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اسی لیے آثار قدیمہ کے وفدوں میں مختلف علوم کے متخصصین کی ایک جماعت بھیجی جاتی ہے ۔

یا ادب کے بارے میں ایک مثال لے لیجیے ۔ ایک محقق کو ایک کتاب کا مخطوطہ ملتا ہے ۔ کتاب کا موضوع تاریخ ہے ۔ لیکن تاریخ کی تحریر میں کئی دیگر مضامین بھی اکثر آجاتے ہیں ، مثلاً سیاسیات ، فن حرب ، قانون ، اخلاقیات ، ثقافت ، انسانیات وغیرہ ۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ محقق اس کے متن کا تعین کرکے اور اپنی معلومات کی روشنی میں اس پر ایک مقدمہ تحریر کرکے کتاب کو شائع کر دے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کتاب کے مختلف پہلوؤں یعنی سیاسیات ، فن حرب ، قانون ، اخلاقیات ، لسانیات وغیرہ سب کا مطالعہ اور تحقیق شروع کر دے ۔ اور جب تک ان سب پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لیے مواد اکٹھا نہ ہو اس وقت تک مخطوطے کو حرز جاں بنائے رہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسری صورت جدید طریقۂ کار کے منافی ہے ۔ محقق کا فرض ہے کہ وہ اپنی معلومات کی مدد سے مخطوطے یا اس کے بارے میں مختصر معلومات جلد از جلد شائع کرا دے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مزید غور اور تحقیق کا کام متعلقہ متخصصین کے لیے چھوڑ دے ۔

یہ طریقۂ کار اختیار کرنے کی ضرورت پر میں اس لیے زور دے رہا ہوں کہ میں ایسے کئی حضرات کو جانتا ہوں جن کے پاس اہم مخطوطات تھے یا جنھوں نے بعض موضوعات کے بارے میں اہم مواد جمع کیا تھا لیکن اسے شائع نہیں کیا کیوں کہ انھیں مزید معلومات کی تلاش رہی یا اگر مواد مل گیا تو اسے حسب دل خواہ مرتب کرنے کی فرصت ملنے کے منتظر رہے۔ مواد یا فرصت کے اسی انتظار میں جوان سے بوڑھے ہوئے، سروس سے ریٹائر ہوئے پھر بھی فرصت نہ ملی، اور اگر فرصت ملی تو صحت نے ساتھ نہ دیا اور آخرکار اسی حالت میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اہم مواد جو انھوں نے جمع کیا تھا، وہ بھی ان کے بعد ضائع ہو گیا۔ وہ خود کوئی اہم کام نہیں نہ کر سکے اور علمی دنیا ان کی کاوشوں کے نتائج سے محروم ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تجربہ ہم میں سے بیشتر حضرات کا ہوگا۔ ایسے متعدد اہل علم سے اکثر ملاقات ہوتی ہے جنھوں نے اہم کام کیا ہے لیکن وہ اسے مرتب کرنے کے لیے "فرصت" ملنے کا برسوں سے انتظار کر رہے ہیں اور دنیا ان کے کام کی افادیت سے محروم ہے۔

اس اصول کی طرف توجہ دلانے سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ محقق کام میں لاپروائی یا تساہل سے کام لے۔ ایک انتہا یہ ہے کہ محقق کو جونہی معلومات یا

کوئی مواد حاصل ہو وہ اس پر غور کیے بغیر فوراً اس کی اشاعت کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دے ۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ محقق ساری عمر ایک ہی کام کی تکمیل کی کوشش میں اس سے چمٹا رہے اور دوسرے اہل علم کو اس کی نوعیت سے کبھی روشناس نہ کرائے ۔ یہ دونوں طریقہ کار انتہاپسندانہ ہیں ؛ اس بارے میں اصول اعتدال پر چلنے کی ضرورت ہے ۔

تحقیق اور ریسرچ میں باہمی تعاون کی ضرورت

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی یا ملتے جلتے موضوع پر ایک سے زیادہ متخصصین کام کرتے ہیں ۔ محقق کے پاس اپنی دسترس کے مطابق کچھ مواد ہوتا ہے لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ کوئی دوسرا محقق اس موضوع پر کام کر رہا ہے یہ متخصصین ایک دوسرے سے رابطہ قائم نہیں کرتے بلکہ اکثر ایک محقق کوشش کرتا ہے کہ دوسرے محقق کو معلوم نہ ہونے پائے کہ اس کے پاس کیا مواد موجود ہے ۔ یہ انداز کار تجارت میں نفع بخش ہو تو ہو ، اہل علم کے شایان شان نہیں ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی محقق کو اتفاق سے معلوم ہو گیا کہ فلاں مواد فلاں جگہ موجود ہے ؛ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوئی دوسرا محقق پہلے سے

اس موضوع پر کام کر رہا ہے ، وہ اس مواد کو حاصل کرکے اور کچا پکا مرتب کرکے شائع کرا دیتا ہے ۔ یہ طریقۂ کار بھی تحقیق کی اخلاقیات کے منافی ہے ۔ اگر ایک محقق کو معلوم ہو جائے کہ دوسرا محقق اسی موضوع پر کام کر رہا ہے تو مناسب یہی ہے کہ وہ اس سے رابطہ قائم کرکے باہمی مفاہمت سے طے کرے کہ کون کیا کام کرے گا ۔ یا اس موضوع کے لیے تقسیم کار کے بارے میں فیصلہ کر لیا جائے ۔ عمومی طور پر یہ اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ جس محقق نے کسی موضوع پر کام پہلے شروع کیا اور اس کے پاس اس کا مواد نسبتاً زیادہ اور موثر ہے اس کا حق اس موضوع پر مرجح ہے ۔ جس محقق نے اس موضوع پر بعد میں کام شروع کیا اس کا اخلاقی فرض یہی ہے کہ وہ اپنا مواد اول الذکر محقق کو پیش کردے ۔ اور اگر ممکن ہو تو اس کام میں اس کی مدد کرے ۔ تحقیق کی پیش کش میں اس کی امداد کا کماحقہ اعتراف کرنا متعلقہ محقق کا فرض ہوگا ۔

علمی رابطہ قائم رکھنے کے لیے یہ بھی مناسب ہے کہ محقق خود اپنی تحقیق کے نتائج کو مکمل یا اجمال کی صورت میں متعلقہ متخصصین کے علم میں لائے تاکہ اس کے کیے ہوئے کام کا احتساب ہو سکے اور تحقیق کا کام آگے بڑھے ۔

اب میں احتساب کے نازک مسئلے کے بارے میں کچھ عرض کروں گا ۔ یہ مسئلہ نازک اس لیے ہے کہ اس کی نوعیت کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے اردو ادب کے متخصصین میں نہایت افسوس ناک انتشار پھیلا ہوا ہے ۔ اور ان کی باہمی مخاصمتوں کی وجہ سے علمی فضا اچھی خاصی مکدر ہو کر رہ گئی ہے ۔

احتساب ، ہجو نگاری اور انتقام :

ہوتا یہ ہے کہ کسی محقق کا کوئی مضمون یا کوئی کتاب شائع ہوئی ۔ اگر کسی دوسرے محقق کو وہ کتاب کسی وجہ سے پسند نہ آئی یا خود مصنف صاحب کسی وجہ سے پسند نہ ہوئے تو وہ محقق صاحب (تبصرہ نگار، تنقید نگار یا تنقیص نگار) اس کتاب کے بخیے ادھیڑنا شروع کردیتے ہیں ۔ جہاں مصنف کی کوئی غلطی ملی وہ اس پر تبصرہ کرنے کے سلسلے میں مصنف کو وہ بے نقط سناتے ہیں کہ ان کا احتساب علمی سطح سے گر کر ہجو نگاری کی سطح پر آجاتا ہے ۔ اور پھر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے ، بعض اوقات مصنف کی شخصیت ، شکل و صورت ، قوم ، وطنیت ، مذہب ، درس گاہ ، سب کو اس بے بایاں "احتساب" کی زد میں لے آتے ہیں ۔ بعض ایسے افراد بھی ہیں جو خود کوئی مثبت علمی کام شاذ و نادر ہی کرتے ہیں لیکن جب

ضرورت ہوتی ہے ، تنقیص نگاری ضرور فرماتے ہیں ۔

جب یہ بجو نما "احتساب" مصنف کے علم میں آتا ہے تو اگر وہ مرنجاں مرنج قسم کا آدمی ہوتا ہے تو اسے نظر انداز کردیتا ہے یا آئندہ کے لیے علمی کام سے توبہ کرلیتا ہے ۔ لیکن ذرا جی‌دار قسم کا مصنف خاموش نہیں بیٹھتا ۔ وہ اس "حملہ" کے بعد انتقامی کارروائی کرنے کے لیے پے در پے "حملے" کرتا ہے اور بعض اوقات کچھ اسی سطح پر اتر آتا ہے جس سطح پر ہجو نما احتساب کیا گیا تھا ۔ وہ محتسب صاحب کی تعلیم ، قرابت ، شجرۂ نسب ، ذریعۂ معاش وغیرہ سب ہی کا "محاسبہ" کر ڈالتا ہے ۔ اگر خدانخواستہ کسی بااقتدار عہدے پر فائز ہے تو ساری عمر محتسب صاحب کو نہیں بخشتا ۔ اور ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ محتسب یا تنقیص‌نگار صاحب کی علمی زندگی معرضِ خطر میں پڑ جائے ۔ اس انتقامی کارروائی کے ردعمل کے طور پر مزید انتقامی کارروائیاں شروع ہوتی ہیں اور عمل اور ردعمل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے ۔ پارٹیاں بنتی ہیں ، سازشیں ہوتی ہیں ، اکھاڑے جمتے ہیں ، عزت داروں کی پگڑی اچھلتی ہے ۔ حق دار حق سے محروم کیے جاتے ہیں ۔ اور اسی اکھاڑ پچھاڑ میں علمی کام میں رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں ۔ اگر ملک میں علمی کاموں کا معیار قائم رکھنا ہے تو یہ تماشا ختم ہونا چاہیے ۔

تنقیص نگاری اور "سنگ اولیں" :

سب سے پہلی بات جو اس مسئلے کے ضمن میں سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ احتساب تحقیق کے لیے ضروری ہی نہیں بلکہ اس کا ایک جزولاینفک ہے - ہر تحقیقی پیش کش پر احتساب ضروری ہے ورنہ علمی کام کی ترقی نہیں ہوسکتی - دوسرے یہ کہ انسان کی بنائی ہوئی ہر چیز کی طرح علمی کام میں بھی خامیاں ہو سکتی ہیں - محقق سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے، اس کی تحقیق یا رائے غلط ہو سکتی ہے - لیکن اس سے محقق کے بارے میں سوء ظن قائم نہیں کیا جاسکتا - ارسطو سے لے کر آئن سٹائن تک ہر فاضل کی تحقیق اور استقراء نتائج میں سقم ملتے ہیں جن کے بارے میں معاصرین یا متاخرین نے احتساب کے بعد بحثیں کی ہیں - کسب معاش کے سلسلے میں راقم الحروف کا تعلق ملک کی انتظامیہ سے ہے اور انتظامیہ کا ایک تسلیم شدہ اصول یہ ہے کہ اگر کام کیا جائے تو غلطی کا امکان ہروقت موجود رہتا ہے - غلطی کے امکان کو یکسر ختم کرنے کی صورت صرف یہی ہے کہ کام ہی نہ کیا جائے - چناں چہ جو لوگ کام نہیں کرتے ، وہ غلطی بھی نہیں کرتے -

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر محقق غلطی کرتا ہے تو اسے کیا سزا دی جائے - اگر اسے سنگ سار کرنا ہی مقصود ہے تو حضرت عیسیٰ سے منسوب روایت کے پس منظر میں

"سنگ اولیں" اٹھانے کا حق اسی کو پہنچتا ہے جس نے خود کبھی غلطی نہ کی ہو - "سنگ بار" محتسب کو یہ اصول پیش نظر رکھنا چاہیے -

ضرورت اس بات کی ہے کہ تحقیق اور احتساب سے متعلق تحریروں میں وہ انداز فکر اختیار کیا جائے اور وہ زبان استعمال کی جائے جو علمی کاموں کے لیے مخصوص ہے۔ طنز و مزاح کے لیے دوسرے موضوع ہیں - علمی تحریروں کی آبرو ان کی معروضیت اور سنجیدگی ہوتی ہے - احتساب کا مقصد مصنف پر اپنے علم و فضل کی فوقیت ثابت کرنا نہیں ہونا چاہیے - احتساب کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جو کام کیا گیا ہے اس کا جائزہ لیا جائے : اس کے محاسن اور معائب پر متوازن انداز میں روشنی ڈالی جائے تاکہ کام آگے بڑھ سکے - رائے کا متوازن ہونا ضروری ہے زیر نظر کام میں اغلاط کی نشان دہی کے ساتھ اس کے محاسن پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے - اور تعریف کرنے کے ساتھ اس کے کمزور پہلوؤں پر اظہار رائے کرنا بھی ضروری ہے - کوئی انسان صرف اچھا یا صرف برا نہیں ہوتا - ہر اچھے آدمی میں خامیاں ہوتی ہیں اور ہر برے آدمی میں کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں - یہی بات انسان کی تخلیق پر بھی صادق آتی ہے - اگر محاسن اور معائب دونوں کو معروضی طور پر بیان نہ کیا جائے تو

احتساب یا تبصرہ متوازن نہیں ہوگا ۔ یوں اگر کوئی صاحب احتساب کو تنقیص نگاری ہی تک محدود رکھنا چاہیں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ بیان معروضی ہو اور اس میں صرف حقائق سے بحث کی گئی ہو ۔ تنقیص نگار حضرات میں ایک اچھائی ضرور ہوتی ہے ۔ وہ یہ کہ وہ عموماً اپنے کام میں محنت کرتے ہیں ، چاہے اس کا مقصد کچھ ہی ہو ۔ محنت کرنے والے اہل قلم کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے ۔

علمی تحریر کی معروضیت کا معیار یہی ہے (ادبی تحریر کے لیے یہ ضروری نہیں) کہ لکھنے والا صرف حقائق سے بحث کرے اور منطقی اصولوں سے نتائج اخذ کرے ۔ اور اس عمل میں اس کی اپنی شخصیت ، اس کی اپنی پسند یا ناپسند ، اس کا وطن ، اس کا مذہب ، اس کی قومیت کا احساس اس طرح بے اثر ہوجائے کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ اس تحریر کا مصنف کس قوم ، کس ملک ، کس مذہب ، کس مکتب خیال یا کس معاشرے سے تعلق رکھتا ہے ۔ عملی طور پر اس معیار تک پہنچنا آسان نہیں لیکن اخلاقیات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عمل کو معیار (آئڈیل) سے ناپا جاتا ہے ، معیار کو عمل سے نہیں جانچا جاتا ۔

عِلمی تحریروں کے لیے اخلاقیات کے اصول معین کرنے کے لیے یہ چند نکات اہل علم حضرات کی خدمت میں

پیش ہیں ۔ ان کے علاوہ دیگر اہم باتیں بھی ہیں جن پر قارئین کرام غور فرما کر اظہار خیال فرمائیں تو تحقیقی کاموں کے لیے صحیح روایات قائم کرنے میں مدد ملے گی ۔ علمی کاموں سے متعلق اصولوں پر عمل کرانے کے لیے کوئی ضابطۂ قانون نافذ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ کسی ملک کی ترقی کے جہاں اور کئی معیار ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس ملک میں جبری قوانین کم سے کم نافذ ہوتے ہیں ۔ کیونکہ اس ملک کے لوگ قوانین نافذ کرنے کی بجائے ایک ضابطۂ اخلاق بنا کر روایت کی حیثیت سے خود اپنے اوپر نافذ کر لیتے ہیں ۔ ملک کی علمی زندگی میں معیار اخلاق اور تحقیق کے لیے مناسب سائنٹفک طریقہ‌کار اور روایات قائم کرنا ملک کے دانش‌وروں ہی کا حصہ ہے ۔ اگر ان اصولوں کو تسلیم کر لیا جائے تو ان کو عملی شکل اس طرح دی جا سکتی ہے کہ جب بھی کوئی اہل قلم ان اصولوں سے انحراف کرے تو ملک کے دانشور کتب اور رسائل کے توسط سے یک‌زبان ہو کر اس کے خلاف احتجاج کریں ۔ اگر اس طریقۂ کار پر عمل کیا گیا تو یقین ہے کہ ملک کی علمی اور ادبی فضا میں جو انتشار اور کدورت پیدا ہو گئی ہے وہ ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائے گی اور اہل تحقیق کے لیے خوش گوار روایات کی بنیادیں قائم ہو جائیں گی ۔

اشاریہ

مرتبہ امان علی نقوی

آ

آربری ، آرتھر جان ، پروفیسر :
کیمبرج میں اردو - ۲۲۹
اردو کے بین المملکتی تحقیقی رابطے کے ادارے کے قیام کی ضرورت - ۱۸۹
آغا افتخار حسین سے ملاقات - ۲۲۶
مختصر سوانح - ۲۲۷
آرزو ، صدرالدین :
تذکرۂ آرزو - ۷۳
آزاد :
خزانۂ عامرہ - ۷۱
سرو آزاد - ۷۱
آغا افتخار حسین :
پیرس میں اردو ، پنجابی اور سندھی مخطوطات - ۳
مشرقی علوم کی تعلیم کے اداروں میں رابطے کی ضرورت - ۱۸۹
آفتاب ، شاہ عالم ثانی :
دیوان آفتاب ، مخطوطہ (پیرس) - ۳۹

آلدرے ژید - ۱۵۹
آلدرے گمبرتیر - ۳۳ ، ۳۳

الف

ابراہیم خلیل :
صحوف ابراہیم - ۱۷
ابراہیم ، محمد (مصنف انوار سہیلی) :
چمن بے نظیر یا مجمع الاشعار - ۵۸
ابوالحسن الہ آبادی :
مسرت افزا (مخطوطہ) - ۶۵ ، ۷۱
ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر) :
اردو زبان کا ارتقا (مقالہ) - ۲۴۲
احسن علی خاں :
جنگ اور ادب (مضمون) - ۲۶۴
احمد علی ، پروفیسر :
موت سے پہلے (فرانسیسی سے ترجمہ) - ۴۸
اختر ، واجد علی :
تذکرۂ اختر - ۷۳
اڈیسیس :
رزمیہ شاعری - ۲۸۲
ارمان ، جنم جے متر :
نسخۂ دلکشا (تذکرہ) - ۸۳ ، ۸۹
اقبال :
یورپ میں مطالعہ - ۲۴۹
اقتدا حسن :
پروفیسر اردو ، نیپلز یونیورسٹی - ۴۹

الطاف علی بریلوی ، سید :
جنگ اور ادب - ۲٦۴
الطاف گوہر :
جنگ اور ادب - ۲٦۴
امام الدین :
تذکرۂ مضمون (یا مظلوم) - ۷۷
امام بخش :
تذکرۂ امام بخش - ۷۵
امید :
دیوان ، مخطوطہ (پیرس) - ۳۹
اناطول فرانس - ۱۵۹
انجام :
تذکرۂ گردیزی - ۷۴
انکتیل دوپروں :
اپنشد (فارسی سے ترجمہ) - ۱۳۹
اٹھارویں صدی کا فرانسیسی محقق - ۱۲۷
اردو کی قدیم ترین لغت ، ۱۲ ، ۱۵
بہار اور بنگال میں بولی جانے والی زبانیں - ۱۳۲
اور—پاپائے روم - ۱۴۴
پانڈیچری کا قیام - ۱۲۹
پیرس واپسی - ۱۳۰
تاریخ پیدائش و وفات ۱۵ ، ۱٦ ، ۱۲۸ ، ۱۳۰
تاریخ تصنیف (یادداشت لغت کے بارے میں) - ۱۴۴
تجارتی اور سیاسی مقاصد اور ہندوستانی زبانیں - ۱۳۳
ٹھٹھہ (سندھ) گجرات ، احمد آباد کی زبانیں - ۱۳۲
جنوبی ہند ، بنگال اور وسط ہند کا سفر - ۱۳۰
جنوبی ہند کی دیگر زبانیں - ۱۳۲

جنوبی ہند میں ہندوستانی (اردو) کا رواج - ۱۴۱
چندرنگر میں قیام - ۱۲۹
خزینۂ زبان ہندوستانی - ۱۲۸
ژند اور پہلوی زبانوں کی تعلیم - ۱۲۹ ، ۱۳۰ -
سنسکرت زبان - ۱۲۹ ، ۱۳۰ ، ۱۳۱ -
سورت میں قیام - ۱۲۹
شمالی ہند اور ہمالیہ کے سرحدی علاقے میں بولی جانے والی
زبانیں - ۱۳۲
قرآن کریم کی تعلیمات - ۱۳۸ ، ۱۲۹
مشرقی ہندوستان کا سفرنامہ - ۱۳۳
مور ، فرانسیسی لغت - ۱۴۱ ، ۱۴۲
ہندوستان کا تاریخ و جغرافیہ - ۱۹
ہندوستان کی تاریخ ، مذہب ، تہذیب ، سیاست وغیرہ - ۱۳۰
ہندوستان کی لسانی تقسیم - ۱۳۶ ، ۱۳۷
ہندوستانی (مور) زبان - ۱۳۱
ہندوستانی (مور) کا رواج جنوبی ہند میں - ۱۴۱
ہندوستانی (مور) رسم الخط - ۱۳۱ ، ۱۳۲
ہندوستانی میں دوسری زبانوں سے استفادے کی صلاحیت - ۲۳۰
اوسان :
اردو کے مخالفین کو جواب - ۱۰ ، ۱۲
اوصاف علی مرزا :
غالب کی تاریخ وفات - ۲۵۱
ایلیڈ :
رزمیہ شاعری - ۲۸۲
سرو آزاد - ۱۷
ایوب خان ، فیلڈ مارشل ، صدر پاکستان :
افرو ایشیائی سیمینار کا افتتاح - ۲۳۷

ب

بالی ، غلام قطب الدین :
گلشن بے خزاں - ۶۲
باقر ، مولوی محمد :
گلشن بے خار - ۶۲
بالزاک : ۲ ، ۳
باوسانی :
اردو اور ہندو فارسی شاعری کی تاریخ میں غالب کا مقام -
۲۵۴
استاد نیپلز یونیورسٹی - ۴۹
فیض کی شاعری - ۲۵۷
بخشش علی فیض آبادی ، سید :
اقبال نامہ - ۸۱
برگساں ، آنری : ۱۵۹
بوٹروس ، مسٹر :
تذکرۂ ذوق - ۷۸
بوولف :
رزمیہ شاعری - ۲۸۲
بلانڈ :
مستشرق (برطانوی) - ۶۵
مسرت افزا (مخطوطہ) - ۶۵
بیدئے :
فرانسیسی رزمیہ نظم کی اشاعت - ۱۸۳
بیلی ، گراہم : ۱۵۴

پ

پاپائے روم :
اردو کی قدیم ترین لغت - ۱۳
پاسترلک - ۱۶۵
پرودوم - ۱۵۹
پردست - ۲۱۳
پولی ، موسیو (ماہر ہندوستانیات) - ۳۱
پونیاتوسکی (شہزادہ پولینڈ) - ۲۰۹
پیرلوتی (فرانسیسی سیاح اور ناول نگار)
اسلامی و ہندو فن تعمیر - ۱۹۵ ، ۱۹۶
سفرنامۂ ہند - ۱۹۴

ت

تجلی ، سید ذوالفقار علی ، کاتب گلشن ہند - ۶۳
تجمل حسین :
افروایشیائی سیمینار - ۲۴۸
تقی ، سید محمد :
جنگ اور ادب - ۲۶۴
توچی (مستشرق) - ۴۷ ، ۴۸
توفو (چینی شاعر) - ۲۸۰
توما ، موسیو (مستشرق) - ۳

ٹ

ٹرائر ، کیپٹن :
تذکرۂ گردیزی - ۷۴

ٹیپو سلطان (کا کتب خانہ) :
تذکرۂ گردیزی - ۴۳

ث

ثریا حسین :
دناسی کی تصانیف - ۳۲ ، ۸۴

ج

جواں بخت :
تذکرۂ جہاں دار - ۵۷

چ

چندولال (حیدر آبادی) - ۶۷
چویوان (چینی شاعر) - ۲۸۰
چھوٹے میاں ، مرزا محمد حسن :
تذکرۂ ناصر - ۷۷

ح

حزیں :
دیوان ، مخطوطہ پیرس - ۳۹
حسن منظر ، ڈاکٹر :
جنگ اور ادب - ۲۶۴
حسن ، میر :
تذکرۂ حسن - ۴۷
تذکرۂ شوق ۸۷

حق شان الحق - ۱۹۰ ، ۱۹۱ ،
حمید اللہ ، ڈاکٹر - ۱۶ ، ۱۳۶
حیدری ، حیدر بخش :
گلدستۂ حیدری - ۵۹
حملۂ حیدری (مخطوطۂ پیرس) - ۳۹

خ

خورشید الاسلام ، ڈاکٹر - ۵۷ ، ۱۵۶ ، ۲۵۰

د

دالمبر (فرانسیسی محقق) - ۲۰۳
دانتے - ۲۸۹
دوپیریر (فرانسیسی ناول نگار) - ۲۷۳
دوشوا ، شارلٹ - ۹
دوشوم : ۲۱
دیدیرو (فرانسیسی محقق) - ۲۰۳

ذ

ذاکر علی :
دتاسی - ۸۲
دفتر بے مثال - ۸۲
ذوق ، محمد ابراہیم :
تذکرۂ ذوق - ۷۸
دفتر بے مثال میں تاریخ وفات - ۸۲

ر

راجا الاس رائے :
کمال مانک پوری - ٦٧
راجا جے نرائن :
کمال مانک پوری (بجو) - ٦٧
راجندر لال متر - ۸۹
رالف رسل - ۴۵ ، ۱۵۵ ، ۱۵٦ ، ۱۵۷ ، ۲۵۰ ، ۲۹۴
رام چند ، بابو :
تذکرۃالکاملین - ۹۷
دتاسی - ۹۷
رحمت علی - ۳۴
روماں رولاں - ۱۵۹

ز

زور آور سنگھ :
مثنوی (مخطوطہ پیرس) - ۳۹
زور ، محی الدین ، ڈاکٹر - ۱۵۴

ژ

ژفریں ، مادام :
حالات زندگی ، افکار ، کردار - ۱۹۸ تا ۲۱۱
سالون (دانشوروں کے دیوان خانے) - ۲۰۲
ژفریں ، موسیو - ۲۰۷
ژولیت دروے - ۱۴۷ ، ۱۴۸

س

سارتر، ژاں پال :
ادبی انعامات - ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۹
ادب برائے زندگی - ۱۶۱
الجیریا کی جنگ آزادی - ۶۶، ۱۷۵، ۱۷۶
انسانیت کی آزادی ۱۷۲، ۱۷۳
اہل قلم کے فرائض اور ذمہ داریاں - ۶۹، ۱۵۹
آزادی کی راہیں - ۲۸۳، ۲۸۴
بیان کا تجزیہ - ۷۷، ۱۷۰
ناول نگار - ۱۷، ۸۵، ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۴۵
نوبل پرائز سے متعلق اعلان کی اشاعت ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵
مشترک تہذیب - ۱۶۳
مشرق اور مغربی ثقافت کا تصادم - ۱۶۲، ۱۶۴
مشرقی ثقافت، ۱۷۳، ۱۷۴
ساحر لدھیانوی - ۲۶۳
سالیرنو، وینو، پروفیسر - ۴۸
ستاندال - ۲۱۳
سپرانگر - ۷۵، ۷۷، ۷۸
سحر انصاری - ۲۶۴
سراج الدولہ - ۱۳۷
سرشار، رتن ناتھ - ۱۵۷، ۱۹۲
سرور، میر محمد خان اعظم الدولہ - ۷۹
سعادت خان لکھنوی ثم لکھنوی - ۷۷
سعادت یار خان رنگیں - ۶۵
سعدی - ۶۸

سودا - ۴۸
سویرلو (ڈاکٹر) - ۲۵۸
سین (مسٹر) - ۴۷

ش

شائستہ اکرام اللہ - ۱۵۴
شملہ یونیورسٹی - ۳
شوپنہاور - ۲۴۲
شورش ، غلام حسین - ۷۸
شورش ، محمد یار - ۷۵
شوق ، قدرت اللہ - ۷۲
شولوخوف :
اور نوبل انعام - ۱۶۵
اور ڈان بہتا رہا - ۲۸۳
شیفتہ - ۶۱

ص

صابر ، قادر بخش (شہزادہ) - ۶۱
صہبائی ، امام بخش - ۶۴

ض

ضیاء احمد - ۳۸

ط

طالسطائی - ۲۸۷

طپش ، میر محمد اسماعیل جان - ۶۳

ع

عاشق ، مہدی علی - ۳ے
عبادت بریلوی ، ڈاکٹر - ۴۵
عبدالماجد (حیدر آبادی) - ۴۳
عبداللہ جان - ۲۸۲
عزیز احمد - ۱۵۶
عشق ، غلام محی الدین ، میرٹھی :
تذکرۂ سخن - ۷۳
طبقات سخن - ۸۱
علی ابراہیم :
تذکرۂ مضمون - ۷۷
علی ابراہیم :
گلزار ابراہیم - ۶۳
علی سردار جعفری - ۲۶۳
عمر خیام - ۲۴۲

غ

غالب :
اردوے معلی - ۲۵۳ ، ۲۶۲
انگلستان میں مطالعہ - ۲۵۰
اٹلی میں مطالعہ - ۶۳ ، ۲۵۴
اودھ اخبار - ۲۵۱ ، ۲۵۳
تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی - ۲۵۰
پنج آہنگ - ۲۵۳

دستنبو - ۲۵۳
دیوان ریختہ - ۲۵۳
فارسی دیوان ۲۵۱ ، ۲۵۳
قاطع برہان - ۲۵۳
مہر نیم روز - ۲۵۳
حیات و تصانیف کا جائزہ - ۲۶۲
خطوط کا انگریزی ترجمہ - ۳۵
دیوان مرزا نوشہ - ۲۵۰
دیوان غالب ، سنہ طباعت وغیرہ - ۲۵۱
'سرکاری اخبار' لاہور - ۲۵۱
شوق ، مرزا خداداد بیگ - ۲۵۱
فرانس میں مطالعہ - ۲۵۰
کلیات - ۲۵۱
قربان علی بیگ ، مرزا - ۲۵۲
مجموعۂ کلام کانپور - ۲۵۱
مسز اوصاف علی - ۲۵۲
مادام بیش سوا - ۲۵۹
یورپ میں مطالعہ - ۲۴۹

ف

فریڈرک مسترل - ۱۵۹
فلوبیر - ۲۱۳
فیض احمد فیض - ۲۳۶
فیلن - ۷۲

ق

قاسم ، دہلوی ، سید ابوالقاسم - ۶۵

قائم ، ضیاالدین علی - ۶۸
قدوس صہبائی - ۲۶۳
قربان علی بیگ ، مرزا - ۲۵۲
قزلباش ، مرزا محمد رمضان خان - ۳۹

ک

کُرنائی - ۲۷۳
کُسترو - ۲۷۳
کاکیتو - ۲۱۳
کامیو - ۲۱۳
کریم الدین ، منشی :
تذکرۃ النساء - ۷۹
طبقات الشعرا - ۷۲
گلشن ہند - ۶۰
گلدستۂ نازنیناں - ۵۹
کلیم ، محمد حسین - ۷۰
کمال مالک پوری - ۶۶ ، ۶۷ ، ۶۸
کیفی اعظمی - ۲۶۳

گ

گارسیں دتاسی :
تذکرے کا مصنف - ۱۵ ، ۲۵۰
اردو قواعد - ۲۵
اقبال نامہ - ۸۱
بہارستان ناز - ۸۰
تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی - ۵۱

تذکرۂ ذوق - ۸۷
تذکرۃ الکاملین - ۹۷
تذکرۃ النسا - ۹۷
تذکرۂ شورش - ۸۷
تذکرۂ گلشن سخن (مبتلا) - ۸۱ ، ۸۲
تذکرۂ مصحفی - ۷۶
تذکرۂ مضمون - ۷۷
تذکرۂ میر حسن - ۸۱
تذکرۂ نادر - ۸۲
تذکرۂ ناصر - ۷۷
دفتر بے مثال - ۸۲
ذاکر علی کا تذکرہ - ۸۲
رام چندر ، بابو - ۹۷
طبقات سخن - ۸۱
عمدۃ المنتخبہ - ۹۷
کریم الدین - ۹۷
گلدستۂ نازنیناں - ۵۹
مجمع النفائس - ۸۰ ، ۸۱
نسخۂ دلکشا - ۸۳ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۹۵ ، ۱۲۵
ثریا حسین کا مقالہ - ۴۲
چمن بے نظیر - ۵۸
دیوان ولی - ۴۲
سودا - ۴۲
عیارالشعرا - ۴۲
لانگزو - ۴۲
لانگزو - ۲۱
میر - ۴۲

وکٹر اوگو - ۲۷
ولی - ۴۲
کردیزی ، فتح علی حسین - ۳۷
گلزار احمد ، برگیڈیر - ۲۶۴
گلکرسٹ - ۱۵۴
گمبرتیر ، موسیو - ۱۵۴ ، ۱۸۹
گیسا الکٹ ، مسز - ۲۴۲

ل

لطف ، مرزا علی ، دہلوی - ٦۲
لوئی چہاردہم - ۲۳ ، ٦۳
لوئی آراگاں - ۱٦۵
لوئی ، برنارڈ - ۲۳۵

م

مائل ، پیر ، پروفیسر - ۲۵ ، ۲٦ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱
مارموں تیل - ۲۰٦
مبتلا ، مراد علی - ۸۱ ، ۸۲
مبتلا ، مرزا کاظم - ٦۰
مجتبیٰ حسین - ۲٦۴
محسن ، سید محسن علی - ۷۰ ، ۷۷ ، ۷۸
محمد بخش - ٦۹
محمد حسین - ۵۸
محمد شاہ ، شاہ - ۳۹
مخفی - ۳۹
مردان خان ، محمد - ۲۵ ، ۳۰

مسعود حسین خاں ، ڈاکٹر :
پراگ یونیورسٹی میں اردو - ۲۳۱ ، ۲۳۷ ، ۲۶۰
مصحفی ، غلام ہمدانی - ۶۷
مصطفیٰ خان - ۶۰
مضطر ، ذوالفقار علی بیگ - ۶۰
مقبول نبی - ۵۸۰
مانٹن - ۲۸۱
ملک راج آنند - ۲۳۶
میرائل (ایڈمنسٹریٹر لانگزو) - ۲۵
میر تقی میر - ۶۹ ، ۷۰ ، ۱۵۶
میکیاولی - ۱۶۷

ن

نادر ، مرزا کاب حسین خان بہادر - ۸۲
نرودا - ۱۶۵
نظیر اکبر آبادی - ۲۶۳
نورالدین ، منشی - ۲۵۱

و

وجودیت - ۱۶۲ ، ۱۷۱ ، ۱۷۲
وزیر سنگھ ، پروفیسر - ۲۵۲
وکٹراوگو - ۲۷ ، ۲۸ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ، ۱۳۸ ، ۱۳۹ ، ۲۱۳ ،
۲۳۲
ولی اللہ (سیکنڈ سیکرٹری سفارت خانۂ پاکستان) - ۳۷

ہ

ہیش منوا (مسز) - ۲۵۹ ، ۲۶۳

ہیگل - ۲۶۶ ، ۲۶۷

ی

یان مارک - ۲۵۹ تا ۲۶۳
